مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نابغۂ روزگار شخصیت

محمد اسحاق بھٹی

حدا [illegible]س اورینٹل پبلک لائبریری - پٹنہ

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نابغۂ روزگار شخصیت

محمد اسحاق بھٹی

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری۔ پٹنہ

اشاعت : ۲۰۰۱ء
قیمت : -/۶۰ روپے
غیر ممالک کے لیے : تین ۳ ڈالر

طابع وناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴

حرف آغاز

مولانا ابوالکلام آزاد نابغۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جہاں بھی رہے، جس حیثیت سے بھی رہے، ہر جگہ سربلند و سرفراز رہے اور جس محفل میں رہے، شمع محفل بن کر رہے۔ ان کا میدان عمل بڑا وسیع تھا۔ وہ جس روش پر چلے، اس ہی پر دیر پا نقوش چھوڑے۔ وہ عالم دین تھے، ان کا علم سمندر کی طرح وسیع اور ناپیدا کنار تھا۔ وہ سیاسی رہنما تھے، ان کی سیاسی بصیرت بے مثال تھی۔ ان کا تدبر باکمال تھا۔ وہ ہماری جنگ آزادی کے عظیم مجاہد تھے، ان کی حب الوطنی ہر شک وشبہ سے بالاتر تھی۔ ان کے سر پر قیادت کا ایسا تاج تھا جو بڑے سے بڑے صاحب اقتدار اور شہنشاہ وقت کے لیے قابل رشک بن سکتا تھا۔ اور ان کے تاجوں کو شرما سکتا تھا۔ ان کی گفتار میں شہد کی سی لذت اور شیرینی تھی۔ ان کی رفتار میں نرمی، لیکن عزم واستقلال تھا۔ ان کے مزاج میں گلوں کی سی نزاکت اور شگفتگی تھی۔

مولانا ان نادر روزگار ہستیوں میں تھے جو اپنی زندگیاں دوسروں کی خدمت اور فلاح و بہبود کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ وہ نہ صلہ کی خواہش رکھتے تھے اور نہ ستایش کی تمنا۔ وہ نیکی کو خاموشی سے پھیلانے کے قایل تھے۔ اس کی نہ خود تشہیر کرتے اور نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی اجازت دیتے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی حیات میں ہی بے شمار اداروں، تنظیموں اور انجمنوں نے خود کو ان کے نام نامی سے منسوب کرنا چاہا لیکن مولانا نے اس کی اجازت نہ دی۔ اسی طرح حکومت ہند نے جب آپ کی قومی خدمات کے اعتراف کے طور پر سب سے بڑا شہری اعزاز 'بھارت رتن' پیش کرنا چاہا تو اس کے لیے بھی مولانا نے اپنے در استغنا کو وا نہ کیا۔ صبر، استغنا اور قناعت ان کے ہتھیار تھے اور ان ہی سے وہ اپنے مخالفین کو زیر کیا کرتے تھے۔ مولانا نے اپنی خواہشات کو کبھی اپنے اوپر حاوی ہونے نہیں دیا۔ انھوں نے اپنی ذات پر بھی پردہ ڈالا اور صفات پر بھی۔ لیکن ان کی صفات خوشبو کی

طرح پھیل گئیں اور ہر شخص نے حسب استطاعت ان سے اپنے دل و دماغ کو معطر کیا۔ لوگ ان ہی میں محو کر رہ ہوگئے۔ اس سے مولانا کی گوناگوں صفات تو منظر عام پر آئیں، لیکن ان کی ذات پس پشت چلی گئی۔ مولانا کے دیرینہ رفیق جناب عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک کتاب 'ذکرِ آزاد یعنی مولانا آزاد کی رفاقت میں اڑتیس سال لکھ کر بڑا اہم اور بنیادی کام کیا۔ اس میں انھوں نے مولانا کی حیات کے بعض بے حد اہم واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ ان سے مولانا کی 'ذات' کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے لیکن ایک کتاب سے تو کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے تو کئی دفتر درکار ہوں گے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مولانا کے بہت سے گوشے اب تک پردۂ خفا میں ہیں۔ اس لیے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے مولانا کی ذات میں جھانکنے اور تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

گزشتہ سال جناب محمد اسحاق بھٹی کا مولانا آزاد سے متعلق ایک طویل مضمون روزنامہ قومی آواز، دہلی میں قسطوار شایع ہوا تھا۔ بھٹی صاحب اب پاکستان کے باشندے ہیں۔ لیکن آزادی سے قبل انھوں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ سفر میں بھی اور حضر میں بھی، محفلوں میں بھی اور جلسہ و جلوسوں میں بھی۔ عمائد ملت کے ساتھ بھی دیکھا اور علماے کرام کے ساتھ بھی۔ اس طرح مولانا سے انھیں بہت قرب حاصل رہا تھا۔ یہ تمام واقعات انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔ انھوں نے مولانا کی نفسیات اور ذہنی کیفیات کا بھی جائزہ لیا ہے اور بہت سے اہم گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ مجموعی طور پر یہ طویل مضمون بہت مفید اور معلومات افزا ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر قومی آواز کے شکریے کے ساتھ ہم اسے کتابی شکل میں شایع کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہمارے قارئین اس سے کماحقہٗ مستفیض ہوں گے اور ہماری کوشش مشکور ہوگی۔

محمد ضیاء الدین انصاری
ڈائرکٹر

۱۹۳۴ء میں جب کہ میری عمر آٹھ نو سال کی تھی، پہلی دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام اور ان کا ایک بیان سہ روزہ اخبار "مدینہ" (بجنور) میں پڑھا۔ یہ اخبار بہت عرصہ ہوا بند ہو چکا ہے۔ اس کے بعد ایک روزنامے میں ان کی تصویر دیکھی۔ نہایت خوب صورت تصویر تھی۔ ان کی ہلکی سی کھڑی مونچھیں اور فرنچ کٹ داڑھی بہت بھلی لگی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ جب میرے چہرے پر داڑھی آئے گی تو اسی قسم کی داڑھی اور اسی قسم کی مونچھیں رکھوں گا۔

۱۹۴۳ء میں میرا چہرہ بالوں سے آشنا ہوا، اور میں نے وہی کیا، جس کا ایک مدت پہلے دل میں فیصلہ کر چکا تھا اور میں یہی کر سکتا تھا۔ نہ اپنے ظاہر کو ان کے ظاہر سے ہم رنگ کر سکتا تھا، نہ باطن کو ان کی بے پناہ صلاحیتوں کی آماجگاہ بنا سکتا تھا اور نہ قلب و ذہن کو ان کے اوصاف و خصوصیات کے جذب کرنے کی نعمت سے بہرہ ور کرنا میرے لیے ممکن تھا۔ یہ اس کی دین ہے، جسے پروردگار دے۔

شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات "تذکرہ" اور "ترجمان القرآن" وغیرہ کا مطالعہ کر لیا تھا۔ "الہلال" کا فائل مجھے مولانا عبیداللہ احرار مرحوم نے تحفے کے طور پر دیا تھا، وہ پورا پڑھ لیا تھا۔ "البلاغ" بھی اول سے آخر تک دیکھ لیا تھا۔ تقسیم ملک سے تھوڑے دن پیشتر "الہلال" کا وہ فائل مجھ سے ایک ہندو دوست نے پڑھنے کے لیے مانگا اور پھر اسی کے پاس رہا۔

مولانا کے حالات میں سب سے پہلے جو چھوٹی سی کتاب پڑھی وہ روشن لال پٹیالوی کی تصنیف تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ مولانا جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل ہیں۔ یہ بات مہادیو ڈیسائی نے بھی لکھی ہے جو غلط ہے۔ پھر ابو سعید بزمی کی کتاب پڑھی جو بڑی دلچسپ

تھی، اس کا نام ہے "مولانا ابوالکلام آزاد"۔ یہ آزادی سے بہت پہلے کی بات ہے۔ اس میں بزمی مرحوم نے مولانا سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ میں فیروز پور میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف سے علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ اس زمانے میں روزانہ اخبار ایک آنے میں ملتا تھا۔ مجھے اخبار پڑھنے کی لت پڑگئی تھی، لیکن روزانہ ایک آنہ خرچ کرنا مشکل تھا۔ ایک اور لڑکے سے بات کی تو ہم نے دو دو پیسے اکٹھے کر کے اخبار خریدنا شروع کیا۔ سہ روزہ "زمزم" (لاہور) اور "مدینہ" (بجنور) مولانا عطاء اللہ صاحب منگواتے تھے، وہ بھی پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ یہ دونوں اخبار ملکی سیاسیات میں نیشنل ازم کے حامی تھے، اور ان کا حلقہ قارئین اور دائرہ اثر بہت وسیع تھا۔ طویل مدت سے یہ اخبار بند ہو چکے ہیں۔ اب ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوں گے۔

مولانا عبیداللہ احرار عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے، اور ذہنی ہم آہنگی کی بنا پر بے حد شفقت کا اظہار کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ فیصل آباد آگئے تھے اور کچھ عرصے بعد مجلس احرار پاکستان کے صدر منتخب کر لیے گئے تھے۔ ۲۰ر فروری ۱۹۷۵ء کو فیصل آباد میں ان کا انتقال ہوا۔ خدا غریق رحمت کرے، نہایت دلچسپ اور سراپا خلوص آدمی تھے۔ فیروز پور کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور چمرقند کی جماعت مجاہدین اور حریت خواہ حضرات سے ان کے خاندانی روابط تھے۔

ایک دن وہ صبح صبح میرے پاس آئے اور کہا کہ آج بمبئی ایکسپریس سے مولانا ابوالکلام آزاد یہاں سے گذریں گے، وہ لاہور جا رہے ہیں۔ بمبئی ایکسپریس صبح ساڑھے سات بجے فیروز پور ریلوے اسٹیشن پر آتی تھی۔ ہم بھاگم بھاگ وہاں پہنچے اور ایک ایک آنے کا پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر آگے گئے تو لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ گاڑی آئی تو لوگوں نے مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد... امام الہند زندہ باد... کے زوردار نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ادھر ادھر بھاگ کر گاڑی کے تمام ڈبے دیکھ ڈالے۔ مگر مولانا نہیں تھے۔ یہ

خبریوں ہی کسی نے اڑادی تھی۔ ہم منہ لٹکائے واپس آگئے۔

۱۹۴۰ء کے فروری کی کوئی تاریخ تھی کہ شام کو مولانا معین الدین لکھنوی فیروزپور آئے اور میرے پاس ٹھہرے۔ صبح کو حسب معمول دو دو پیسے اکٹھے کر کے اخبار خریدا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر یہ خبر تھی کہ مولانا آزاد لاہور تشریف لائے ہیں اور میاں افتخارالدین کی کوٹھی پر ٹھہرے ہیں۔ ۔ ۔ آج تین بجے سہ پہر موچی دروازے کے باہر جلسہ عام میں تقریر کریں گے۔

فیروزپور سے لاہور کا فاصلہ پچاس میل ہے اور اس زمانے میں وہاں سے لاہور کا کرایہ پانچ آنے تھا۔ موگا سے نندہ بس سروس اور بندہ بس سروس دو کمپنیوں کی بسیں چلتی تھیں جو فیروزپور سے ہوتی ہوئی لاہور پہنچتی تھیں۔ فیروزپور میں ان کا بس اسٹینڈ ملتانی دروازے کے باہر تھا۔

یہاں یہ بھی عرض کردیں کہ نندہ بس سروس کے مالک گلزاری لال نندہ تھے جنھیں پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد عارضی طور پر ہندوستان کا وزیراعظم بنایا گیا تھا۔ پھر دوسری دفعہ غالباً یہ اس وقت چند روز کے لیے ہندوستان کے وزیراعظم بنائے گئے تھے، جب وہاں کی عدالت کے ایک فیصلے کے نتیجے میں اندرا گاندھی کی پارلیمنٹ کی رکنیت اور وزارت عظمیٰ ختم ہوگئی تھی۔ گلزاری لال نندہ دراصل ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے ایمن آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کی نندہ بس سروس لمبے لمبے روٹوں پر چلتی تھی۔ موگا سے لاہور اور لاہور سے سری نگر تک کی بہت سی سڑکوں پر اس کے پہیے گھومتے تھے۔

بہرحال میں اور مولانا معین الدین پانچ پانچ آنے کرایہ خرچ کر کے لاہور پہنچے اور شاہ عالم دروازے اترے جہاں ان بسوں کا اڈا تھا۔ وہاں سے پوچھ کر موچی دروازے گئے، لیکن میدان خالی تھا اور جلسے کے کوئی آثار نہ تھے۔ نہایت کوفت ہوئی کہ اتنے پیسے بھی خرچ کیے اور کوئی بات بھی نہ بنی۔ مایوسی کے عالم میں لوٹے تو اخبار فروش کی ایک دکان پر نظر پڑی۔ اس سے پوچھا:

آج کہیں مولانا ابوالکلام تقریر کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: مولانا تقریر تو کہیں نہیں کر رہے، البتہ گول باغ میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے انھیں چائے کی دعوت دی گئی ہے، اس میں تشریف لائیں گے۔

میں نے معین الدین سے کہا: ایک آدمی کو سارا شہر مل کر چائے پلائے گا؟ ایک آدمی نہیں پلا سکتا؟

بولے: ہمیں اس سے کیا مطلب، شاید یہاں کا یہی رواج ہو گا۔

ہم نے اخبار والے سے پوچھا: گول باغ کہاں ہے؟

اس نے بتایا تھوڑا آگے جاؤ گے تو بائیں جانب انار کلی بازار آئے گا۔ اس کے اختتام پر ایک سڑک آئے گی جس کا نام مال روڈ ہے۔ وہاں سے دائیں طرف گھومو گے تو سامنے بھنگیوں کی توپ دکھائی دے گی۔ اس سے چند قدم آگے گول باغ ہے۔ اس میں قناتیں لگی ہوں گی۔

یہ سب چیزیں ہمارے لیے نئی تھیں۔ ہم سوچنے لگے انار کلی.. مال روڈ... بھنگیوں کی توپ... گول باغ... یہ سب کیا بلا ہے۔

معین الدین نے کہا: یہ چاروں نام اچھی طرح یاد کر لو۔ شاید آگے چل کر کسی سے پوچھنا پڑے۔

میں نے کہا: یاد ہے، بس آگے چلیے۔

بولے: دو نام میں یاد کر لیتا ہوں، انار کلی اور مال روڈ۔ دو تم یاد رکھو، بھنگیوں کی توپ اور گول باغ۔

ہم انار کلی میں داخل ہوئے تو عجب منظر تھا۔ قسم قسم کے مرد اور قسم قسم کی عورتیں، اور ان کے رنگ برنگ لباس... میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ نظارہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

معین الدین نے میری طرف دیکھا تو بولے: کدھر دیکھ رہے ہو، سیدھے چلو۔

میں نے کہا: کسی طرف نہیں دیکھ رہا۔ یاد کر رہا ہوں، انار کلی... مال روڈ.. بھنگیوں کی توپ... گول باغ۔

ہم گول باغ پہنچے تو بے شمار آدمی جمع تھے۔ لوگ کاروں اور تانگوں پر آتے تھے اور اتر کر قناتوں میں داخل ہو جاتے تھے۔ ہماری طرح بہت سے لوگ وہاں کھڑے بھی تھے جو مولانا کو دیکھنا چاہتے تھے... اتنے میں شور ہوا: ''مولانا ابوالکلام آزاد آگئے''... ساتھ ہی نعرے گونجنے لگے۔

ہم دوڑ کر ہجوم کی طرف گئے تو دیکھا کہ سڑک کے عین وسط میں سیاہ رنگ کی ایک کار ہے جو نہایت دھیمی رفتار سے چل رہی ہے۔ اس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے چاروں طرف بہت سے نوجوان لمبے لمبے بانسوں کی دیواریں سی بنائے کار کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں تاکہ لوگ مولانا کو دیکھنے کے بے تابانہ شوق میں یوں آگے نہ بڑھ جائیں کہ گاڑی کا چلنا مشکل ہو جائے.... اس طرح آگے جانے کا راستہ بنتا جاتا تھا۔ مولانا دونوں طرف کھڑے ہوئے لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے خیر مقدمی سلام کا جواب دیتے جاتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہ بچھڑ نہ جائیں، ہجوم میں گھسے اور مولانا کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ انھوں نے کندھوں پر گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے بعد زور کا دھکا لگا اور لوگ دور تک پیچھے چلے گئے۔

یہ مولانا کا پہلا دیدار تھا جو میں نے کیا۔ وہاں سے چلے، بس اسٹینڈ پر آئے اور بس پر سوار ہو کر فیروزپور کو روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں ہمارے دس دس آنے خرچ ہوئے، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھنے کی خوشی میں ہم پھولے نہ سماتے تھے۔

دوسرے دن اخبار خریدا تو صفحہ اول پر نمایاں الفاظ میں یہ خبر دی گئی تھی کہ آج موچی دروازے کے باہر مولانا ابوالکلام آزاد جلسہ عام میں تقریر کریں گے۔ معین الدین میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ پوچھا:

کیا ارادہ ہے؟

انھوں نے معذرت کر دی اور اپنے گھر "لکھو کے" قریب "مرکز الاسلام" چلے گئے۔ لیکن میرا عشق صادق تھا اور جیب میں دو روپے تھے۔ بس اسٹینڈ پر آیا، پانچ آنے کا ٹکٹ لیا، بس میں بیٹھا اور پچاس میل کا سفر طے کر کے لاہور آاترا۔ اب موچی دروازے جانا کوئی مشکل کام نہ تھا، کل اسے اچھی طرح دیکھ گیا تھا۔

جس طرف سے مولانا کو جلسہ گاہ میں داخل ہونا تھا، وہاں دونوں طرف آمنے سامنے پہلے تو احرار رضا کار سرخ قمیصیں پہنے، ہاتھوں میں کلہاڑیاں اٹھائے اور کلہاڑیوں کو ایک دوسری سے ملائے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ اسی طرح سکھ رضا کار کرپان کے ساتھ کرپان کی نوک لگائے ہوئے تھے۔ خاکسار بیلچے سے بیلچہ ملائے اور پھر ہندو نوجوان لاٹھی سے لاٹھی کا سرا جوڑے ہوئے تھے۔ یہ ایک محراب سی تھی، جس کے بیچ میں سے مولانا کو گزرنا تھا۔ دروازے پر ایک بڑا سا کپڑا آویزاں تھا، جس پر موٹے موٹے سنہرے حروف میں مرقوم تھا.... "ہندوستان کا بے تاج بادشاہ مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد"۔

مولانا اس سے چند روز پیشتر آل انڈیا کانگریس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

بے شمار لوگ جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ دور تک انسانوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے۔ میں ہجوم میں گھس گھسا کر اسٹیج کے قریب جا پہنچا۔ اسٹیج پر کئی رہنما بیٹھے تھے، مرد بھی، عورتیں بھی..... ان میں سے دو کو میں پہچانتا تھا جن کا تعلق ضلع فیروز پور کے شہر "زیرہ" سے تھا۔ ایک کا نام علی محمد تھا اور دوسری ان کی اہلیہ تھیں، غلام فاطمہ... یہ خاتون شاعرہ بھی تھیں۔ دونوں میاں بیوی پچاس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔

جلسہ گاہ کے ارد گرد کے مکانوں کی چھتیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ درختوں پر بھی لوگ چڑھے ہوئے تھے۔ میں نے وہاں نصب لاؤڈ اسپیکر گنے تو چودہ تھے۔ اتنے میں ایک صاحب اسٹیج پر آئے۔ گورا سرخ رنگ، خوب صورت کالی داڑھی، سفید کھدر کی پگڑی، کھدر کا کھلے پائنچے کا پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے۔ بارعب شخصیت کے مالک.... کچھ آوازیں بلند ہوئیں، مولانا آزاد آگئے۔

میرے قریب کھڑے ہوئے ایک سکھ نوجوان نے کہا: "ایہہ مولانا داؤد غزنوی نیں۔"

جلسہ گاہ میں ایک شور بپا تھا، مولانا داؤد غزنوی نے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا:

"حضرات! مولانا ابوالکلام آزاد، جن کا آپ کو انتظار ہے، تشریف لانے والے ہیں۔ آپ مہربانی کر کے خاموش ہو جائیں تاکہ مولانا کی تقریر سن سکیں۔"

لیکن شور بدستور جاری رہا۔

اسٹیج سے اعلان ہوا، اب عبدالرحیم عاجز نظم پڑھیں گے ... وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے اور مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سینے پر کتنے ہی تمغے لٹک رہے تھے۔ مائک پر آئے تو تمغوں کی چھنن چھنن کی آوازیں مائک میں سے گزرتی ہوئی لوگوں کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ انھوں نے عالمگیر جنگ اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں پنجابی نظم پڑھی۔ نظم میں پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کا نام بھی آیا، جن کی اس نظم میں مخالفت کی گئی تھی۔ (اس زمانے میں صوبائی وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم کہا جاتا تھا) عاجز کو بہت داد ملی ... ایک نظم غلام فاطمہ نے پڑھی۔ بڑی تیکھی اور موثر آواز تھی ... "ہم تو اپنا ہی مگر گھر مانگتے ہیں"۔ ان کی نظم کا ایک مصرعہ تھا ... ان کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی حکومت سے ہم کوئی اس کی چیز نہیں مانگتے۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمارے حوالے کر دے، جس پر اس نے قبضہ کر رکھا ہے۔

اب اعلان ہوا، مرزا غلام نبی جانباز نظم سنائیں گے۔ سانولا رنگ، میانہ قد انگریزی کٹ کے گھنگھریالے بال، کھدر کا صاف ستھرا کرتا پاجامہ ... جانباز نے ترنم سے نظم پڑھی: "آؤ بخاری سید احرار کی باتیں کریں"۔

اب مولانا تشریف لائے، جو لوگ بیٹھے تھے، وہ ان کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور جو کھڑے تھے، وہ انھیں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے اور "مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد" کے نعروں سے، فضا گونج اٹھی۔

مولانا کرسی پر بیٹھ گئے ... مجمعے کی سطح ساکن اب متحرک ہو گئی تھی۔ مولانا داؤد

غزنوی نے لوگوں سے خاموش رہنے کی اپیل کی، لیکن جلسہ گاہ میں ایک ہنگامہ بپا تھااور ہر شخص آگے بڑھ کر مولانا آزاد کو دیکھنے اور سننے کے لیے مضطرب تھا۔ اسٹیج کے پیچھے شور مچا ہوا تھااور لوگ درختوں پر چڑھ رہے تھے۔

اعلان کیا گیااب ملک نصر اللہ خاں عزیز کی نظم سنئے... !ملک صاحب پرانے اور مشہور صحافی تھے اور مولانا سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ گونڈہ سنٹرل جیل میں قید بھی رہے۔ زندگی کا طویل عرصہ کانگریس میں گزرا۔ پھر جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے تھے۔ یہاں ان کی وہ نظم ملاحظہ کیجئے جو انھوں نے اس جلسے میں پڑھی تھی۔ نظم کا عنوان تھا "امام الہند" نظم خاصی طویل ہے اور اس کا ایک ایک لفظ مولانا آزاد سے محبت و عقیدت کا مظہر ہے۔ ملک صاحب نے ترنم سے پڑھنا شروع کیا اور ان کی دل کش اور پیاری آواز نے سماں باندھ دیا۔

اے امام محترم! اے رہبر عالی مقام!
علم و تدبیر و سیاست ہیں ترے در کے غلام

تیری تحریر و خطابت نازش اسلام ہے
تیرا ہر اک لفظ گویا پارۂ الہام ہے

عزم تیرا کوہ پیکر، حزم تیرا بے مثال
صدق تیرا بے عدیل اور عدل تیرا لازوال

تجھ پہ کھولے حق نے راز و معنی ام الکتاب
فیض ہے روح القدس کا، جس سے تو ہے فیض یاب

تو علم بردار ہے اسلام کی توحید کا
تو امیں ہے اس صدی میں رتبہ تجدید کا

تجھ سے زندہ ہیں مسلماں کی روایات کہن
مستقیم و مخلص و بے خوف و ہمدرد وطن

تجھ سے قائم ہے وطن میں آبرو اسلام کی
تو لگاتا ہے لگن دل میں خدا کے نام کی

کوئی لالچ ہو تو اس لالچ میں آسکتا نہیں
آسماں بھی رفعتوں کو تیری پاسکتا نہیں

قلب مسلم میں جو نور حریت ہے موجزن
تیرے ہی قول و عمل کی شمع کی ہے وہ کرن

بے نیاز شہرت و عزت غنی مال و جاہ
اللہ اللہ ! کتنی اونچی ہے ترے دل کی نگاہ

عزم و ہمت سے اگرچہ دل ترا آسودہ ہے
فکر خدمت سے مگر تیری جبیں آلودہ ہے

استقامت میں نہ کوئی لاسکا تیری نظیر
وہ الہٰ آباد کا برنا ہو یاوردھا کا پیر

کانگریس کو فخر تیری فہم کا، اخلاص کا
رہنمائے محترم ہے عام کا اور خاص کا

غیر مسلم کو بھی تیری عدل پر ہے اعتبار
ہے بھرم اسلام کا تیرے سبب سے برقرار

حبذا پھر سوئے قوم بے نوا آیا ہے تو
مژدہ لا تقنطوا پنجاب میں لایا ہے تو

آہ وہ پنجاب ، جو مظلوم ہے مقہور ہے
جس میں باطل مقتدر ہے اور حق مجبور ہے

پانچ دریاؤں سے ریگستان تک سیراب ہے
کشت حریت مگر ویران ہے بے آب ہے

اس کے ایوانوں میں انسانوں کے بکتے ہیں ضمیر
کھول کر بیٹھے ہیں دکانیں شہ و میر و وزیر

جھوٹ کے صدقے میں ہوتے ہیں سروں کے سر بلند
اہل حق کے واسطے پاداش حق ہے قید و بند

فرقہ پرور اس طرح پھرتے ہیں اس میں آشکار
جس طرح تاریک جنگل میں درندے نابکار

اس متاع ظلم کو شعلہ نوائی چاہیے
خطہ پنجاب کو بھی رہنمائی چاہیے

پھونک دے خاشاک ظلم و جبر کو تدبیر سے
آگ سی ہر سو لگا دے شعلہ تقریر سے

قافلہ ستا رہا ہے، پھر اسے ہشیار کر
سو رہی ہے ملک کی تقدیر، اسے بیدار کر

نام ہے آزاد تیرا، ہند بھی آزاد ہو
یہ غلام آباد بھی آزاد ہو، دل شاد ہو

اس نظم کے ایک ایک مصرعے پر ملک نصراللہ خاں عزیز کو داد ملی، لیکن سنا ہے کہ ان کے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے، اس میں یہ نظم شامل نہیں کی گئی۔

نظم کے بعد مولانا تقریر کے لیے مائک پر آئے۔ اونچی دیوار کی کالے رنگ کی ٹوپی، قدرے چھوٹی موری کا پاجامہ، شیروانی زیب تن، کندھوں پر دونوں طرف لٹکتی ہوئی گرم چادر۔ دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھے ہوئے... وہ مائک پر آئے تو ان کی زیارت کے شائقین کی آوازیں باہم ٹکرا کر پھر شور کا رنگ اختیار کر گئیں۔ انھوں نے تقریر شروع کی اور کہا: "بہنو اور بھائیو"...!

لیکن شور بند نہیں ہوا.... مولانا چند سکنڈ خاموش رہے۔

پھر فرمایا: ''کیا جو لوگ میری پشت کی جانب ہیں، خاموش رہیں گے ؟''

یہ کہنا تھا کہ سناٹا چھا گیا۔ جو لوگ درختوں پر چڑھ رہے تھے، وہ جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ اب وہ چمگادڑوں کی طرح درختوں سے چپٹے ہوئے تھے۔

ان دنوں یورپ کی باہر سے گوری، اندر سے کالی فضاؤں میں دوسری عالم گیر جنگ زوروں پر تھی اور اس کے لیے ہندوستان کی فوجی امداد انگریزی حکومت کے لیے نہایت ضروری تھی۔ مولانا نے اسی موضوع پر تقریر کی۔ تقریر کے بعض حصے اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

یورپ جنگ کی لپیٹ میں آ چکا ہے اور برٹش گورنمنٹ مشکلات کے طوفان میں گھر گئی ہے۔ ہمارا اس سے براہ راست تعلق ہے۔ وہ کامیابی کے لیے ہندوستان سے فوجی امداد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ غلام ہندوستان بغیر کسی واضح یقین دہانی کے اس کی طرف دست تعاون نہیں بڑھا سکتا۔ جو لوگ جنگ کی ہولناکیوں، خوفناکیوں، المناکیوں، ہیبت ناکیوں اور وحشت ناکیوں سے واقف ہیں، انھیں اس آگ کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے بار بار سوچنا پڑے گا۔

انھوں نے کہا: ہم عدم تشدد کے حامی ہیں اور ہمیشہ ہمارا یہی نقطہ نظر رہا ہے۔ اس سے انحراف کر کے ہم تشدد کی راہ نہیں اختیار کر سکتے۔

انھوں نے فرمایا: میں اپنی آواز آپ کے کانوں تک پہنچا سکتا ہوں، آپ کے دل میں نہیں اتار سکتا۔ دل میں وہی اتار سکتا ہے جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے اور علیم بالذات الصدور ہے۔

تقریر پینتیس (۳۵) منٹ جاری رہی۔ فضا بالکل ساکت و صامت اور مجمع ہمہ تن گوش... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف نور کی چادر تنی ہوئی ہے۔

مجھے مولانا کو اتنا قریب سے دیکھ اور ان کی تقریر سن کر جو خوشی ہوئی، وہ بیان سے باہر تھی۔ تقریر ختم ہوئی تو بس پر سوار ہوا اور دل میں بے انتہا مسرتیں سمیٹے فیروز پور پہنچا۔ دوسرے دن اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ تقریر شائع ہوئی تو جھوم جھوم کر پڑھی۔

مولانا آزاد کی یہ پہلی اور آخری تقریر تھی جو میں نے سنی۔اس کا نشہ اب بھی باقی ہے۔۔۔۔ یہاں اس تقریر کے بارے میں ایک اور روایت بھی سنتے جایئے۔۔۔!

ہندوستان کے ممتاز عالم اور دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مہتمم سید ابوالحسن علی ندوی کے عزیزوں میں ایک بزرگ سید احمد الحسنی تھے جو میرے مہربان تھے۔ کسی زمانے میں وہ لاہور میں مقیم تھے اور سعودی حکومت کے کلچر سنٹر میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی، لیکن عربی اور انگریزی میں بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ شرافت و نجابت کے اوصاف ان کو اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملے تھے۔ متانت و تہذیب کا پیکر اور اسلامی ثقافت کا بہترین نمونہ۔۔۔۔ ان کی یادداشتوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور حافظہ مضبوط پایا تھا۔ لاہور سے ان کا دفتر اسلام آباد چلا گیا تھا اور وہ ریٹائر منٹ کے بعد وہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ لاہور آتے تو ملاقات کے لیے ہمارے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) ضرور تشریف لاتے۔ بڑی پیاری اور میٹھی باتیں کرتے تھے۔

آخری مرتبہ ۱۰؍اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ادارے میں تشریف لائے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد لاہور میں وفات پائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس ملاقات میں ان سے بہت سی باتیں ہوئیں، مولانا آزاد کی اس تقریر سے متعلق بھی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ جس دن مولانا نے یہ تقریر کی تھی اس دن وہ لاہور میں تھے اور انھوں نے تقریر سنی تھی۔ اس وقت ان کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فارسی کا یہ شعر پڑھا تھا۔

گر گفتہ ز عشق گہے حرف آشنا ۔۔۔ آنہم حکایتست کہ ازما شنیدہٗ

۱۹۴۶ء میں ریاست فرید کوٹ (مشرقی پنجاب) میں پرجامنڈل کی تحریک شروع کی گئی تھی، جس میں مجھ سمیت کئی افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ان دنوں آل انڈیا کانگریس کے اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو پنجاب کانگریس کے صدر تھے۔ وہ فرید کوٹ آئے اور والیٔ ریاست مہاراجا ہر اندر سنگھ سے گفتگو کی تو گرفتار شدہ لوگوں کو رہا

کر دیا گیا تھا، لیکن ان سے جو شرائط صلح طے ہوئی تھیں، مہاراجا ان پر قائم نہیں رہا تھا۔ اس اثنا میں ہم نے ایک میمورنڈم تیار کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں دہلی بھیجا، جس میں واقعات کی تفصیل درج تھی اور لکھا تھا کہ مہاراجہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہا۔ یہ میمورنڈم ۱۹۴۷ء کے مارچ میں بھیجا گیا تھا۔ اس سے ڈھائی تین مہینے پہلے ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء کو مولانا عارضی حکومت میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے تھے۔ سکھ صاحبان اس حکومت کو "ڈنگ ٹپاؤ راج" کہا کرتے تھے جو انیٹرم گورنمنٹ کا صحیح ترین پنجابی ترجمہ تھا۔

میں اور میرے ایک بزرگ دوست قاضی عبیداللہ اپنے ریاستی مسائل مولانا کے گوش گزار کرنے کی غرض سے دہلی کے لیے تیار ہوئے تو مولانا معین الدین لکھنوی نے بھی ہمارے ساتھ جانے کا عزم کر لیا۔ اس سے چار سال قبل مولانا معین الدین کی شادی دہلی کے ممتاز اہل حدیث عالم دین مولانا محمد جونا گڑھی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ہم دہلی گئے تو انہی کے مکان پر ٹھہرے۔ یہ ۲۰ر جون ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ دوسرے دن ۲۱ر جون کو گیارہ بجے کے قریب ہم تینوں جمعیت علمائے ہند کے دفتر پہنچے اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا سیوہاروی سے اثنائے گفتگو میں ہم نے عرض کیا کہ ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ مہربانی فرما کر آپ ٹیلی فون کر کے ان سے ہماری ملاقات کی کوئی صورت پیدا کرا دیجئے۔

انھوں نے فرمایا مجھے ٹیلی فون کرنے میں کوئی عذر نہیں، مولانا میرے مہربان ہیں لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ٹیلی فون کرنے یا کرانے کی غلطی نہ کریں۔ مولانا خود ٹیلی فون سنتے نہیں، ان کے سکریٹری اجمل خاں صاحب سنیں گے اور کہہ دیں گے مولانا مصروف ہیں، ان کے پاس ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے۔ آپ یوں کریں کہ صبح پانچ یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے مولانا کی کوٹھی پر پہنچ جائیں۔ وہ ۲۲ر پرتھوی راج روڈ (نئی دہلی) میں رہتے ہیں۔ کوٹھی کے ایک دروازے پر "IN" لکھا ہے اور ایک پر "OUT"...! جس دروازے پر IN لکھا ہے، وہاں ایک گورکھا پہرے دار بیٹھا ہوگا، اسے اپنے نام کی

چٹ لکھ کر دے دیں، وہ مولانا کو پہنچادے گا اور مولانا آپ کو اندر بلالیں گے۔ آؤٹ والے دروازے کی طرف نہ جائیں، ادھر اجمل خاں کا کمرہ ہے۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ قد لمبا اور جسم فربہ ہے۔ سر پر بال بہت کم ہیں (یعنی تقریباً ٹنڈ) کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں۔ اگر انھوں نے دیکھ لیا تو مولانا سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔

ہم نے مولانا سیوہاروی کا شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر چلے آئے۔

اس زمانے میں معروف مصنف و مدرس مولانا محمد عبدہ صاحب دہلی کے مدرسہ رحمانیہ میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ شام کو ہم ان سے ملنے گئے۔ انھیں بتایا کہ کل ہم مولانا آزاد سے ملنا چاہتے ہیں، یہ سن کر وہ بھی تیار ہو گئے۔ اب ہم چاروں دوسرے دن یعنی ۲۲ر جون کو پانچ بج کر دس منٹ پر مولانا کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ دیکھا تو وہی نقشہ تھا جو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے بتایا تھا۔ مولانا معین الدین نے گورکھے پہرے دار کو چٹ دی جس پر لکھا تھا:

''وفد ریاست فرید کوٹ''

وہ چٹ لیکر اندر چلا گیا اور ہم جلدی سے کوٹھی کے برآمدے میں جا کھڑے ہوئے۔ ہمیں اجمل خاں صاحب کا ڈر تھا کہ وہ دیکھ نہ لیں۔

لیکن ہم نے ان کو دیکھ لیا تھا۔ ان کا رخ دوسری طرف تھا اور وہ ٹہل رہے تھے۔

برآمدے میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ابھی مولانا معین الدین نے اپنی کلے اور طرے والی پگڑی دیکھنا اور ٹھیک کرنا شروع کی تھی کہ گورکھا باہر آیا اور ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ کہا بیٹھیے، مولانا تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے بیٹھتے ہی چاروں طرف نظر دوڑا کر کمرے کا جائزہ لیا، قالین بچھا ہوا تھا، دروازوں پر بادامی رنگ کے کھدر کے پردے لٹک رہے تھے، صوفوں پر بھی کھدر کا کپڑا چڑھا ہوا تھا درمیان میں دیوان رکھا تھا جو اونچائی میں صوفوں سے قدرے کم تھا۔ الماریوں میں کتابیں تھیں، جن کی جلدیں نہایت خوبصورت تھیں اور سنہری حروف میں ان کے نام لکھے تھے۔

اتنے میں میرے بالکل سامنے کے دروازے کا پردہ ہلا، مولانا کمرے میں داخل ہوئے اور فرمایا: "السلام علیکم"۔

اس واقعے پر پچاس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، لیکن یہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ مولانا نے انگوٹھے والی براؤن رنگ کے چمڑے کی چپل پہن رکھی تھی جو عام طور پر اس زمانے میں گھر میں پہنی جاتی تھی۔ اب اس چپل کا رواج نہیں رہا۔ سر پر اونچی دیوار کی سیاہ رنگ کی ٹوپی، سفید کھدر کا قدرے تنگ پائنچے کا پاجامہ، سفید کھدر کی بغیر کالر کے قمیص جس کے بٹن کھدر کے دھاگوں کو اکٹھا کر کے بنائے گئے تھے۔ اوپر کا بٹن کھلا ہوا اور آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئیں۔ ہم ایک دم کھڑے ہو گئے۔ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کروں گا۔ خدا جانے اس کے بعد موقع ملے یا نہ ملے۔ میرے ساتھیوں نے ایک ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا جو ان کی وہابیت کی علامت تھی۔ مولانا نے بھی ان سے ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کیا، لیکن میں نے فرط عقیدت سے سر جھکا کر دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ مولانا نے بھی ازراہ نوازش دونوں ہاتھوں سے مصافحہ فرمایا۔

ہم کھڑے تھے، فرمایا: "تشریف رکھیے"۔

ہم اسی طرح صوفوں پر بیٹھ گئے، جس طرح ان کی آمد سے پہلے بیٹھے تھے۔ مولانا نے چپل اتاری اور آلتی پالتی مار کر دیوان پر بیٹھ گئے۔ دیوان اونچائی میں صوفوں سے قدرے چھوٹا تھا۔ ہم نے اپنی نشست کو کچھ اونچی محسوس کیا اور یہ سوئے ادب خیال کیا کہ مولانا سے اونچی جگہ پر بیٹھیں۔ ہم صوفے سے اٹھ کر نیچے قالین پر بیٹھنے لگے تو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فرمایا:

نہیں نہیں، آپ یہیں تشریف رکھیے۔

چنانچہ ہم تعمیل ارشاد میں صوفے پر بیٹھ گئے۔

میں نے کلائی کے اندر کی طرف گھڑی باندھ رکھی تھی اور مولانا کی گھڑی کلائی

کے اوپر تھی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ گھڑی کو حرکت دیکر کلائی کے اوپر کر لیا۔ مولانا نے بیٹھتے ہی فرمایا: "کہیے کیا ارشاد ہے؟"

میں توقع رکھتا تھا کہ اس کا جواب میرے ساتھیوں میں سے کوئی صاحب دیں گے جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے، مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند ثانیے خاموشی رہی تو میں نے سوچا، اگر تھوڑی دیر کوئی نہ بولا تو مولانا ہمیں باہر نکال دیں گے کہ یہ گونگے میرا وقت ضائع کرنے کو یہاں آگئے ہیں، میں نے جرأت کر کے عرض کیا:

"جناب! ہم ریاست فرید کوٹ سے حاضر ہوئے ہیں، میں وہاں کی پرجا منڈل کا جنرل سکریٹری ہوں۔"

اس کے بعد تین چار منٹ میں وہ حالات بیان کیے جن سے ہم گزر رہے تھے۔ مولانا محمد عبدہ کے پاس چھتری تھی، مولانا نے چھتری پکڑی اور اس کی موٹھ کو انگشت شہادت سے گھماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> تین مہینے قبل مارچ کے آخری ہفتے میں آپ کا میمورنڈم مجھے ملا تھا۔ میں نے اسے پڑھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ کے راجا مکر جانے میں ماہر ہیں۔ آپ لوگوں کی گرفتاری کے زمانے میں جواہر لال وہاں گئے تھے، اور راجا سے جو شرائط طے ہوئی تھیں، ان میں ایک شرط گرفتار شدہ افراد کی رہائی تھی اور اسی دن آپ کو رہا کر دیا گیا تھا۔ یہ سب باتیں جواہر لال نے مجھے بتائی تھیں۔ لیکن اس کے بعد آپ کے میمورنڈم سے اور آج خود آپ سے معلوم ہوا کہ راجا فرید کوٹ ان شرائط پر قائم نہیں رہے۔ ملک کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں، اسکا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کا از سر نو جائزہ لینے کی کوشش کریں۔ میں جواہر لال سے بات کروں گا اور اگر موقع ملا تو آپ کے راجا کے سامنے بھی مسئلے کی صحیح تصویر پیش کروں گا۔

ہم حیران ہوئے کہ ہزاروں آدمی ان کے پاس آتے ہیں اور خط بھیجتے ہیں، لیکن

ان کا حافظہ کتنا مضبوط ہے کہ ہم لوگوں کی معمولی سی باتیں بھی جوان کے علم میں آئیں، انھیں ذرہ ذرہ یاد ہیں۔

ہم میں سے کسی نے کہا: ہم صرف آپ سے ملاقات کے لیے اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آئے ہیں اور آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ملاقات کے لیے وقت دیا۔

فرمایا: اس میں شکر گزار ہونے کی کون سی بات ہے۔ مسلمان کا مسلمان سے ملنا اور ملنے کے لیے کہیں آنا جانا عین عبادت ہے۔

یہ بات یہیں ختم ہو گئی اور سلسلہ کلام آگے چلا۔

اس زمانے میں کانگریس کے صدر آچاریہ کرپلانی تھے جو مولانا کے دور صدارت میں کانگریس کے جنرل سکریٹری رہ چکے تھے۔ کچھ عرصہ پیشتر نواکھلی میں جو ہندو مسلم فساد ہوا تھا، وہ اس کے اسباب و وجوہ کا کھوج لگانے اور اس کی تحقیقات کے لیے وہاں گئے تھے۔ واپس آکر انھوں نے ورکنگ کمیٹی میں اس سے متعلق تفصیلی رپورٹ پیش کی تھی اور اخبارات میں بھی مفصل بیان دیا تھا۔ بعد ازاں گڑھ مکتیشر میں فساد ہوا، جس میں مسلمانوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ گڑھ مکتیشر میں جو فساد ہوا ہے، وہ اچاریہ کرپلانی کے اخباری بیان کا نتیجہ ہے۔ انھیں ورکنگ کمیٹی کو تو تفصیلی رپورٹ دینا چاہیے تھی، لیکن اخبار میں تفصیل سے بیان دینا مناسب نہ تھا۔ انھوں نے اس طرح بیان دیا ہے جس طرح سکریٹری، صدر کو رپورٹ پیش کرتا ہے۔ وہ بھول گئے کہ اب وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری نہیں، صدر ہیں، ان کے بیان میں فرقہ پرستی کا زہر بھرا ہوا تھا جس کا ہندوؤں پر یہ ردعمل ہوا کہ انھوں نے گڑھ مکتیشر میں مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ پٹیل اور کرپلانی دونوں فرقہ پرست ہیں اور مسلمانوں کے قتل کی ذمے داری ان پر عائد ہوتی ہے۔

یہ بات بہت سخت تھی، لیکن میں نے جرأت کر کے کہہ دی۔ اگر مولانا سے نہ کہی جاتی تو اور کس سے کہی جاتی۔ مولانا نے ساری بات نہایت تحمل سے سنی اور فرمایا:

میرے بھائی! اس ملک کی مٹی میں فرقہ پرستی رچی ہوئی ہے۔ پٹیل
اور کرپلانی ہوں یا کوئی اور..... جو بھی اس سرزمین میں پیدا ہوا ہے، وہ اپنے
دامن کو فرقہ پرستی کی آلودگی سے بچا نہیں سکا۔ میں نے مستقبل کے
ہندوستان کے لیے اس کا جو حل سوچا تھا، وہ ۶/اپریل ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ
مشن کے ممبروں کے سامنے رکھا تھا۔ اس کے بعد ۱۲/اپریل کو اسے
کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا اور خاصی بحث کے بعد ورکنگ کمیٹی
نے اسے منظور کر لیا تھا۔ پھر ۱۵/اپریل کو ایک بیان کی صورت میں
اخبارات میں شائع کرادیا تاکہ مسلمان اور دوسری اقلیتیں اس پر غور کر
سکیں۔ اگر اسے مان لیا جاتا تو میرے نزدیک یہ فرقہ وارانہ مسئلے کا بنیادی
حل تھا، کیوں کہ اب اہم مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ کے سیاسی اختلافات کا
نہیں رہا بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔

مولانا نے گروپنگ اسکیم کے سلسلے میں فرمایا کہ:

اس کی رو سے ہندوستان کے تمام صوبے اے، بی، سی تین گروپوں میں
تقسیم ہوتے تھے۔ میرے فارمولے سے ہندوستان کے مسلمان،
اکثریت کے خدشے سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مرکز
میں پانچ وزیر ہندو اور پانچ مسلمان ہوں گے۔ ایک سکھ، ایک اچھوت،
ایک عیسائی اور ایک پارسی ہوگا۔ اس طرح چودہ وزرا میں سے پانچ وزیر
مسلمان ہوتے اور مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کے برابر نمائندگی
ملتی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جن تین یا پانچ سالوں میں جیسا بھی آئین
میں فیصلہ کیا جائے، ملک کا صدر ہندو ہوگا تو وزیراعظم مسلمان ہوگا۔ صدر
مسلمان ہوگا تو وزیراعظم ہندو ہوگا۔ یعنی مرکزی حکومت میں مسلمان
اور ہندو برابر ہوں گے۔ میں نے یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ اس

فارمولے کو دس سال کے لیے آزمایا جائے، اگر اس مدت میں یہ فارمولا کامیاب نہ رہا تو ملک تقسیم کردیا جائے۔ موجودہ دور کھچاؤ کا دور ہے، اس میں تقسیم سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔ حالات ایسی نازک منزل میں داخل ہو چکے ہیں کہ تقسیم کے نتیجے میں جو اقلیت، اکثریت کے علاقوں میں ہوگی، وہ خطرات میں گھر جائے گی۔

مولانا نے فرمایا:

گروپنگ اسکیم جو کرپس نے پیش کی تھی، فرقہ وارانہ کشیدگی سے بچنے کے لیے یہ اسکیم میں نے ہی کرپس کے حلق میں ڈالی تھی۔ میں نے یہ سب باتیں کانگریس سے منوالی تھیں۔

انھوں نے فرمایا:

میں نے لیاقت علی سے کہا تھا کہ آدھے پنجاب، آدھے بنگال، ایک سلہٹ کے ضلع اور سندھ اور سرحد کے دو صوبوں پر اکتفا نہ کرو، یہ دو صوبے تو پہلے ہی مرکز کی امداد کے محتاج ہیں۔

انھوں نے کہا: "پھر کیا کریں؟"

میں نے کہا:

"پورے پنجاب، پورے بنگال اور پورے آسام کا مطالبہ کرو، جہاں مجموعی حیثیت سے مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اگر یہ مطالبہ نہ مانا جائے تو تحریک چلاؤ جس کا رخ برٹش گورنمنٹ کی طرف بھی ہو اور کانگریس کی طرف بھی۔ گرفتاریاں دو اور تحریک اس وقت تک جاری رکھو جب تک مطالبہ مان نہیں لیا جاتا۔ انگریز کسی ایک فریق کو حکومت دے کر نہیں جائے گا۔

مولانا نے فرمایا: لیاقت علی مان گئے تھے، لیکن آگے منوا نہ سکے۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا: میں نے لیاقت علی سے یہ بھی کہا

تھا کہ انتظامیہ 'فوج' پولس اور دوسرے محکموں کے افسروں کے لیے پاکستان جانے کا اعلان نہ کرو، ان کو یہیں رہنے دو، البتہ جو شخص اپنی مرضی سے جانا چاہتا ہے، وہ چلا جائے۔ فوج اور پولیس میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلمان اس وقت زیادہ تعداد میں ہیں، ان کا ہندوستان میں رہنا ضروری ہے۔ آزادی کے بعد ملک کے مختلف صوبوں میں بکھرے ہوئے پانچ کروڑ مسلمانوں کا تحفظ وقت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ملک جن حالات میں تقسیم ہو رہا ہے، اس کے پیش نظر آئندہ مسلمانوں کو نئی ملازمتوں کے حصول میں مشکلات پیش آئیں گی۔

مولانا نے فرمایا: میں نے لیاقت علی سے یہ بھی کہا تھا کہ مسلم لیگ کے جن بڑے رہنماؤں کا تعلق ہندوستان سے ہے، ان کو اپنے ملک کی سکونت ترک نہیں کرنی چاہیے۔ انھیں یہاں رہ کر مسلمانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ان کی حفاظت اور خدمت کا اصل وقت اب آیا ہے۔

اثنائے گفتگو میں مولانا نے ہندوستان کی ریاستوں کا ذکر بھی کیا۔ فرمایا میری تجویز تھی کہ کشمیر اور حیدر آباد دونوں ریاستوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔

پھر کچھ تامل کے بعد ارشاد فرمایا: حیدر آباد میں بے شک مسلمان اقلیت میں ہیں، لیکن یہ ریاست ان کی تہذیب اور ثقافت کی مظہر ہے۔ کشمیر کا حکمران غیر مسلم ہے لیکن وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے....

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اب تیزی کے ساتھ معاملات کچھ دوسرا رخ اختیار کر رہے ہیں۔

اس وقت یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا کہ ہم ترک وطن پر مجبور ہوں گے، مولانا معین الدین نے سوال کیا کہ ہم لوگ جو مختلف مقامات میں دینی مدارس چلا رہے ہیں، آزاد ہندوستان میں ہمیں کس طرح کام کرنا چاہیے۔

مولانا نے اس سے چند روز پہلے لکھنؤ میں مسلمانوں کے ایک تعلیمی اجلاس میں مستقبل کی تعلیمی پالیسی کے بارے میں چند تجاویز پیش کی تھیں، اس کا حوالہ دیتے ہوئے

انھوں نے فرمایا: ''اس سلسلے میں جو تجاویز میں نے لکھنؤ کے اجلاس میں پیش کی تھیں، وہ آپ نے پڑھی ہوں گی، دینی مدارس کے تمام حلقوں نے ان پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔

فرمایا: اجلاس میں دار العلوم دیوبند کے اصحاب انتظام بھی موجود تھے، میری ان سے بات ہوئی، انھوں نے میری تائید کی اور مجھے اپنے تعاون کا یقین دلایا''۔

مولانا نے فرمایا: ''اس معاملے میں آپ فکر مند نہ ہوں، آپ حالات کے مطابق کام کرتے رہو۔ (مولانا نے اسی طرح فرمایا تھا۔ دو تین مرتبہ انھوں نے بات ''آپ'' سے شروع کی اور ''کرو'' پر ختم کی) ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق کام کرنا چاہیے، وہ طاقت سے زیادہ کام کرنے کا مکلف نہیں۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔

یقین جانیے جب انھوں نے قرآن کے یہ الفاظ پڑھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ الفاظ اسی سلسلے میں اترے ہیں اور یہی ان کا شان نزول ہے۔

ایک موقعے پر ہمارے ایک ساتھی نے بعض مسلم لیگی لیڈروں کی مخالفت میں کچھ الفاظ کہے، لیکن مولانا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری بات شروع کر دی۔

تمام گفتگو کے دوران میری نظریں مولانا کے چہرے پر جمی رہیں اور میں ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتا اور لب و لہجے کا جائزہ لیتا رہا۔ جی چاہتا تھا، مولانا باتیں کرتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ انھوں نے گھڑی دیکھی تو باتیں کرتے ہوئے پینتالیس منٹ ہو چکے تھے..... فرمایا

''آٹھ بجے کیبنٹ میٹنگ ہے، اب اجازت چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر چھتری رکھ دی جو پینتالیس منٹ ان کی انگلیوں مین گھومتی رہی تھی اور کھڑے ہو گئے۔ سب نے ایک ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے پھر جوش عقیدت سے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ انھوں نے بھی ازراہ کرم مجھ سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔

ہم سوا پانچ بجے مولانا کے کمرے میں داخل ہوئے تھے، چھ بجے باہر نکلے۔ دیکھا تو باہر ہجوم عاشقاں تھا۔ بہت سے سکھ، مسلمان اور ہندو ملاقات کے انتظار میں کھڑے تھے۔

کوٹھی کے گیٹ کے باہر بھی لوگ موجود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسد نہیں، تو رشک و رقابت کی نگاہوں سے یہ لوگ ہمیں ضرور دیکھ رہے ہوں گے۔ اجمل خاں صاحب بھی دوسری طرف کھڑے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے انھوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہماری کامیابی اور اپنی شکست پر حیران ہوتے ہوں گے۔

ہم اپنی اس فتح پر پھولے نہ سماتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کے لیے دل سے بے ساختہ دعا نکلتی تھی، جنھوں نے مولانا سے ملاقات کا یہ نسخہ کیمیا ہمیں بتایا تھا۔

ایک ساتھی نے کہا، اب واپس جانے کے لیے بس پر سوار ہو جائیں۔ بس آئی تو اس کو روکنے کے لیے مولانا محمد عبدہ صاحب نے چھتری سے اشارہ بھی کر دیا، لیکن وہ بس اسٹاپ نہیں تھا، لہذا بس نہیں رکی۔ میں نے کہا، بھائی، پیدل چلیں اور مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، مشترکہ طور پر اس کا وظیفہ پڑھیں۔

میں نے مولانا کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ نے ان کو جہاں بے پناہ فہم و فراست اور حسن بیان سے نوازا ہے، وہاں شکل و صورت کی نعمت بھی فراوانی سے عطا کی ہے اور بڑے پیار سے ان کا ہیولا تیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے حافظ نے یہ شعر انھی کے لیے کہا تھا:

نصاب حسن در حد کمال است — زکوٰتم دہ کہ مسکین و فقیرم

اس پیکر حسن نے ہمیں خالی ہاتھ نہیں لوٹایا تھا، اپنے افکار و دیدار کی زکوٰۃ سے ہمارا دامن طلب بھر دیا تھا۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دو تین دفعہ ایسا ہوا کہ دوران گفتگو میں مولانا نے ہمیں "آپ" سے خطاب کر کے بات شروع کی اور "کرو" پر ختم کی۔ یعنی آپ یوں کرو۔ میں اس پر انتہائی متعجب ہوا۔ جی چاہا کہ ان سے پوچھوں حضرت یہ کیا اسلوب تخاطب ہے؟ لیکن ادب مانع تھا۔ باہر آکر ساتھیوں سے کہا کہ مولانا نے ایسا کیوں کیا؟ جو بات لفظ "آپ" سے شروع کی جائے، اسکا محل اختتام "کریں" یا "کیجیے" ہونا چاہیے، اگر محل اختتام "کرو" ہے تو آغاز "تم" سے ہونا چاہیے۔

مولانا معین الدین نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ مولانا جب بات شروع کرتے تھے تو ہمیں "معزز مہمان" سمجھ کر "آپ" کہتے تھے، لیکن جملہ ختم کرنے پر آتے تو انھیں خیال آتا کہ یہ برخوردار ہیں، انھیں "کرو" کہنا چاہیے۔

بہر حال مولانا کا یہ انداز تخاطب ذہن میں رہا، جس کا بعض حضرات سے ذکر بھی کیا۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ دلی اور اس کے ارد گرد کے بعض علاقوں کی بول چال کی گھریلو زبان میں یہ اسلوب تخاطب چلتا ہے جو بڑے چھوٹوں کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ اس سے پہلے میں "سلہٹ" کو جو بکسر میں ہے "سلہٹ" بفتح سین پڑھتا اور بولتا تھا۔ اب مولانا کی زبان سے سنا تو معلوم ہوا کہ لفظ سلہٹ سین کے کسرے کے ساتھ ہے۔

مولانا "فرقہ وارانہ" اور "ذمہ وارانہ" (واؤ سے) بولتے تھے۔ اس سے قبل، میں یہ الفاظ "فرقہ دارانہ" اور "ذمہ دارانہ" (دال سے) بولتا تھا..... مولانا داؤد غزنوی بھی واؤ سے بولتے تھے۔

یہ مولانا سے پہلی باقاعدہ نشہ آور ملاقات تھی۔ اس کا نشہ اب بھی اسی طرح ہے جس طرح پچاس سال پہلے تھا۔ مولانا کی یہ باتیں اپنے وطن جا کر بے شمار لوگوں کو سنائیں۔ یہ میری کمزوری کہیے یا مولانا سے انتہا درجے کا تعلق خاطر اور فراوانی عقیدت کہ اب بھی کوئی دوست بات شروع کر دے تو نہایت ذوق و شوق سے تمام باتیں بتفصیل سناتا ہوں۔ آج آپ حضرات کو بھی اس محفل رنگیں میں شریک کر لیا۔

مجھے سیاسیات سے کوئی خاص تعلق یا دلچسپی نہیں اور اس کا کوئی گوشہ بھی میرا موضوع نہیں۔ لہذا اس بحث میں ہرگز نہیں پڑوں گا کہ پچاس سال قبل کے حالات میں سیاسی نقطہ نظر سے مولانا کی یہ باتیں لائق تائید تھیں یا نہیں تھیں۔ میں نے جو کچھ ان سے سنا تھا، بیان کر دیا۔ یہ میری یادداشتوں کا حصہ تھا جسے تحریری شکل دے دی گئی ہے... اور اس کی فقط یہی حیثیت ہے۔

مولانا سے یہ ملاقات ۲۲/جون ۱۹۴۷ء کو ہوئی تھی۔ اس سے دو مہینے بعد ملک

میں فسادات کا ہولناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہماری ریاست فرید کوٹ میں راولپنڈی وغیرہ کے علاقوں سے اروڑے سکھ اچھی خاصی تعداد میں چلے گئے تھے جن کی وجہ سے فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں کچھ دوستوں کے کہنے سے میں اور قاضی عبداللہ دہلی گئے اور ۱۳ راگست کو مولانا سے ملے۔ ان دنوں مولانا خود بھی بہت پریشان تھے۔ ہم نے ان کو اپنی ریاست کے حالات سے آگاہ کیا اور تفصیلات عرض کیں۔ ان دنوں اتفاق سے راجا فرید کوٹ دہلی میں تھے، مولانا نے ان سے ٹیلی فون پر بات کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست فرید کوٹ کی حدود میں مسلمانوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا، حالاں کہ ان دنوں پنجاب کی تمام سکھ ریاستوں اور پورے مشرقی پنجاب میں کشت و خون کا بھیانہ کھیل جاری تھا۔

یہ مولانا سے میری دوسری ملاقات تھی جو پندرہ منٹ کی تھی۔ اس میں ریاست فرید کوٹ کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہوئی۔

چلتے چلتے یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ ریاست فرید کوٹ میں ایک گاؤں ”ارائیاں والا“ تھا۔ اس گاؤں کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی جن کا تعلق ارائیں برادری سے تھا اور ان میں زیادہ تر پڑھے لکھے اور متمول لوگ تھے۔ بعض حضرات تو ریاست کے اچھے خاصے مناصب پر فائز تھے اور والیِ ریاست اور دیگر اہل کاروں کے نزدیک انھیں احترام کا مقام حاصل تھا۔ آزادی کے بعد پاکستان میں بھی ان میں سے بعض لوگ اونچے سرکاری عہدوں پر متمکن ہوئے۔

ارائیاں والا کی حدود میں اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دو آدمی سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان سے کچھ لوگ فرید کوٹ گئے تو وہ اپنے پہلے حکمران مہاراجا فرید کوٹ سے بھی ملے۔ انھوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ مہاراجا نے خود ان سے ارائیاں والے کے ان مقتولین کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے ان کے قتل پر بہت افسوس ہوا یہ بھی کہا کہ انھیں جو اطلاعات پہنچی تھیں، ان سے پتا چلا تھا کہ وہ دونوں معزز آدمی غلطی سے مارے گئے تھے اور اس میں خود ارائیاں والے کے لوگوں کی بھی غلطی تھی۔ وہ

سکھوں کے ایک قافلے کو روکنے کے لیے آگے بڑھے تھے جو اس طرف سے گزر رہا تھا۔ سکھوں نے سمجھا کہ یہ لوگ ہم پر حملہ کر رہے ہیں، اس طرح وہ مارے گئے۔

مہاراجا نے کہا وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ریاست میں کسی قسم کا فساد اور ہنگامہ بپا ہو اور ریاست کا کوئی شخص کسی کے ہاتھوں مارا جائے۔

کئی سال ہوئے ریاست فرید کوٹ کا یہ آخری حکمران مہاراجا ہراندر سنگھ وفات پا چکا ہے اس کا ایک ہی بیٹا تھا، وہ باپ کی زندگی ہی میں عالم جوانی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب نہ وہ ریاست رہی ہے نہ اس کا حکمراں دنیا میں موجود ہے، نہ اس کا کوئی وارث ہے اور نہ ہم اس کی رعیت ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مہاراجا ہراندر سنگھ معقول اور ہم درد حکمراں تھا۔ وہ اپنی رعایا کے سب لوگوں کو برابر کا درجہ دیتا تھا۔ سکھ، مسلمان، اچھوت، چمار وغیرہ اس کے نزدیک بہ طور رعیت کے مساوی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے آباواجداد کے بارے میں بھی پرانے لوگ اچھے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

سیاسیات میں، ہم لوگ مہاراجا ہراندر سنگھ کے شدید مخالف تھے۔ ریاستی پرجامنڈل کی طرف سے ہم نے اس کی حکومت کے خلاف تحریک بھی چلائی اور گرفتار بھی ہوئے۔ لیکن بلاشبہ وہ بحیثیت حکمران کے بھی اور بحیثیت انسان کے بھی شریف آدمی تھا اور لوگوں سے ہمدردی اور خیر خواہی کا برتاؤ کرتا تھا۔

گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ مولانا آزاد نے ہم سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انھوں نے لیاقت علی خاں کو مسلم اکثریت کے تمام صوبوں کا مطالبہ کرنے اور مطالبہ منظور نہ ہونے کی صورت میں تحریک چلانے کا مشورہ دیا تھا، جس کا رخ برطانوی حکومت کی طرف بھی ہو اور کانگریس کی طرف بھی....!

۱۹۷۱ء کے دسمبر میں مشرقی پاکستان کے سقوط پر اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ بات میں نے مولانا عطاء اللہ حنیف کے مکان پر ملک حسن علی جامعی شرق پوری مرحوم کو

بتائی۔ انھوں نے میری بات سن کر کہا کہ مجھ سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان) نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ۱۴ر جون ۱۹۴۷ء کو جب کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے تقسیم ہند کی قرارداد منظور کرلی تو میٹنگ سے فارغ ہو کر مولانا اسی وقت نواب زادہ لیاقت علی خاں کے پاس نئی دہلی میں ان کی قیام گاہ "گل رعنا" پہنچے۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ مولانا نے اردلی سے کہا:

لیاقت علی کو میری آمد کی اطلاع دو۔

اس نے کہا: وہ سو رہے ہیں۔

مولانا نے فرمایا: انھیں جگاؤ اور کہو آزاد آئے ہیں۔

اتفاق سے بیگم رعنا لیاقت علی خاں جاگ رہی تھیں۔ انھوں نے مولانا کی آواز سنی تو جلدی سے باہر آئیں... آداب عرض کیا اور اس وقت زحمت فرمانے کی وجہ پوچھی۔

مولانا نے فرمایا: لیاقت علی کو جگاؤ۔

لیاقت علی خاں آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور مولانا کو سلام کیا۔ مولانا نے فرمایا: ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ختم کر کے سیدھا یہاں آیا ہوں۔ تقسیم ہند کی تجویز میری مخالفت کے باوجود منظور ہو گئی ہے۔ اب تقسیم کی اس صورت کے خلاف تحریک چلاؤ.... (پھر مولانا اور لیاقت علی خاں کے درمیان وہ گفتگو ہوئی جو پہلے بیان ہو چکی ہے)

یہاں یہ عرض کردوں کہ میں نے کئی پرانے سیاست دانوں سے سنا ہے کہ مولانا آزاد اور لیاقت علی خاں کے باہمی تعلقات بہت اچھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لیاقت علی خاں نے سیاست کے اس ہنگامہ خیز دور میں مولانا سے متعلق کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ذہنی اذیت کا باعث ہو.... مولانا تو کوئی ایسی بات زبان سے نکالتے ہی نہیں تھے جو دوسرے کے لیے کسی صورت میں تکلیف دہ ہو سکتی ہو۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں پروفیسر محمد سرور جامعی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک تھے۔ میں بھی وہیں خدمات انجام دیتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی شکست سے

دوسرے دن چودھری فضل الٰہی (جو بعد میں پاکستان کے صدر بنائے گئے) سرور صاحب سے ملاقات کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے اور اس المیے پر گفتگو کرنے لگے۔ میں بھی موجود تھا، لیکن خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ سرور صاحب نے بھی اپنے آپ کو سماعت تک محدود رکھا۔

چودھری صاحب مرحوم نے بتایا کہ ۱۹۵۶ء میں جب وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر تھے، کسی حکومتی معاملے میں دہلی گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنا تو ان کے پروگرام میں شامل تھا، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضری دینا ان کے پروگرام کا حصہ نہ تھا۔ تاہم وہ اپنے طور پر مولانا کو سلام کرنے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔ اس لیے کہ (بقول ان کے) کسی زمانے میں وہ مولانا سے بہت متاثر تھے۔ نہایت ذوق شوق سے ان کی تقریریں سنتے اور تحریریں پڑھتے تھے۔

تحریک خلافت میں بھی ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ کسی زمانے میں ان کا شہر اور ضلع (گجرات) سیاسی تحریکوں بالخصوص تحریک خلافت کا مرکز رہا تھا اور مولانا کئی مرتبہ وہاں گئے تھے اور تحریک عدم تعاون کے دور میں ان کے نام سے گجرات میں ہائی اسکول بنایا گیا تھا، وہ اس اسکول کے طالب علم رہے تھے۔ اب دہلی گئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی باتیں سننے کو جی چاہا۔ لیکن پہلے سے وقت طے کیے بغیر ان سے ملنا مشکل تھا۔ اس لیے کہ:

ایک تو وہ طبعی طور پر بہت کم آمیز تھے اور لوگوں سے زیادہ میل جول نہ رکھتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ وہ مرکزی حکومت کے وزیر تھے اور وزیر کے زیادہ تر پروگراموں کا تعلق سکریٹری سے ہوتا ہے۔ اگر سکریٹری کہہ دے کہ ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ ان دنوں ہندوستان کی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا اس میں مصروف تھے۔ چودھری صاحب نے بتایا کہ ایک دن وہ پارلیمنٹ ہاؤس میں جواہر

لال سے مل کر جارہے تھے کہ دیکھا ایک کمرے کے دروازے پر مولانا کے نام کی تختی نصب ہے۔ وہ وہیں رک گئے، دروازے پر بیٹھے ہوئے سنتری سے پوچھا:

مولانا تشریف رکھتے ہیں؟

اس نے ”جی ہاں“ کہہ کر جواب دیا۔۔۔ اتنے میں کمرے سے ایک شخص باہر آیا تو ہم جلدی سے اندر گھس گئے۔ سنتری روکنے کے لیے ہمارے پیچھے دوڑا مگر ہم آگے نکل چکے تھے۔ مولانا تنہا بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان کو سلام کیا، چند لفظوں میں اپنا تعارف کرایا اور بلا اجازت آنے پر معذرت چاہی۔

فرمایا: ”تشریف رکھیے“۔

ابھی بات شروع نہیں ہوئی تھی کہ اردلی آیا اور کہا باہر پنڈت جی کھڑے ہیں اور ملاقات کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ وزیراعظم خود آیا ہے اور باہر کھڑا اجازت طلب کررہا ہے۔

فرمایا: ”آجائیں“۔

جواہر لال آئے اور آداب بجالا کر بیٹھ گئے۔ مولانا ان کی آمد پر نہ اپنی جگہ سے اٹھے اور نہ ان سے آمد کی وجہ پوچھی۔

چودھری صاحب نے کہا: میں نے مولانا سے خیر وعافیت پوچھنے کے بعد عرض کیا: ”مولانا! آپ تو فرماتے تھے پاکستان نہیں بنے گا، بن گیا تو چل نہیں سکے گا۔۔۔ پاکستان بن بھی گیا ہے اور کامیابی سے چل بھی رہا ہے“۔

جواہر لال خاموش بیٹھے سنتے رہے۔

فرمایا: ”میرے بھائی! میں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ پاکستان نہیں بنے گا، بن گیا تو چل نہیں سکے گا۔ میں اس قسم کی باتیں کرنے کا عادی نہیں۔ میں نے یہ کہا تھا کہ پاکستان نہیں بننا چاہیے۔ یہ دس کروڑ مسلمانوں کے مسئلے کا حل نہیں ہے۔۔۔ اب پاکستان بن گیا ہے، لیکن میری بات یاد رکھو، ہندوستان ایک ملک تھا اور ایک ملک ہے، پاکستان ایک تجربہ

ہے، اسے کامیاب بناؤ"۔

چودھری فضل الٰہی مرحوم نے یہ واقعہ سنا کر غم اور صدمے میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا: مشرقی پاکستان ختم ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ الفاظ کانوں میں گونج رہے اور ذہن میں گردش کر رہے ہیں:

"پاکستان ایک تجربہ ہے اسے کامیاب بناؤ"۔

مولانا اپنے پرانے ساتھیوں پر شفقت فرماتے اور ان کے کام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں ایک بزرگ خواجہ عبدالحی فاروقی تھے جو ہمارے ملک کی گراں مایہ علمی متاع تھے۔ وہ دراصل ضلع گورداس پور (پنجاب) کے باشندے تھے اور مولانا کے اس مدرسے میں خدمات انجام دیتے رہے تھے جو انھوں نے کسی زمانے میں دارالارشاد کے نام سے کلکتے میں قائم کیا تھا اس کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں استاد تفسیر مقرر ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان سے کئی سال بعد دہلی سے لاہور آئے اور اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں تفسیر قرآن کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا..... میرے وہ مشفق تھے۔

ایکدن خواجہ صاحب نے بتایا کہ جب انھوں نے مستقل طور پر دہلی سے لاہور آنے کا فیصلہ کیا تو روانگی سے ایک روز پہلے مولانا کی خدمت میں گئے اور کہا کہ کل وہ دہلی کی سکونت ترک کر کے لاہور جا رہے ہیں۔ آئندہ ملاقات کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ عرصے تک آپ سے قریبی تعلق رہا ہے۔ اگر کسی موقعے پر کوئی لغزش ہوئی ہو تو معافی کی درخواست ہے۔

یہ الفاظ کہہ کر خواجہ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، مولانا بھی آب دیدہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر فرمایا: "اللہ آپ کو ہر حال میں خوش رکھے۔ کسی زمانے میں خوب محفلیں جمتی تھیں، اب وہ دور ختم ہو گیا ہے۔ آپ یہاں سے جا رہے ہیں، میرے لائق کوئی کام ہو تو بتایئے"۔

خواجہ صاحب نے بتایا کہ میں نے مولانا سے عرض کیا۔ "ایک ضروری کام ہے"۔

فرمایا: "کیا؟"

عرض کیا: "وہی چائے پلا دیجیے جو آپ کسی زمانے میں اپنے ہاتھ سے بنا کر پلایا کرتے تھے"

مولانا مسکراتے ہوئے اٹھے۔ اسی قسم کی چائے بنائی اور خود فنجانوں میں ڈالی۔ ایک فنجان مجھے دیا اور ایک خود لیا۔ پرانی یاد تازہ کرنے کے لیے سگریٹ سلگایا اور چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ پہلا کش لگایا اور آخری گھونٹ کے ساتھ سگریٹ ختم کر دیا۔

خواجہ صاحب نے بتایا کہ مولانا انھیں رخصت کرنے دروازے تک آئے، بغل گیر ہوئے، مصافحہ کیا اور دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ کہا... یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

(خواجہ صاحب کے مفصل حالات "نقوش عظمت رفتہ" میں پڑھیے)

مولانا کا سیاسیات میں ایک خاص نقطہ نظر تھا۔ وہ خود تو اس پر سختی سے قائم تھے، لیکن دوسروں کو (اگرچہ ان سے کتنا ہی تعلق ہوتا) اس پر عمل کرنے کے لیے کبھی نہ کہتے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک دفعہ مولانا لاہور آئے۔ میں بھی ملاقات کو گیا، مولانا داؤد غزنوی بھی وہیں تھے۔ انہوں نے مولانا سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہیں تو ہمارے ہم خیال، لیکن کھل کر اس کا اظہار نہیں کرتے۔ مولانا نے فرمایا ہر شخص کا ایک طریق کار اور اسلوب عمل ہوتا ہے۔ وہ اسی کے مطابق اپنی منزل طے کرتا ہے۔

قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ پہلے میں ضلع حصار (موجودہ صوبہ ہریانہ) کے ایک قصبے روڑی گیا۔ وہاں مولانا حکیم عبداللہ قیام پذیر تھے جو بہت سی طبی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے والد مولانا محمد سلیمان تھے جو صالح اور متقی بزرگ تھے اور میرے دادا میاں محمد مرحوم کے دوست تھے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ضلع ملتان میں جہانیاں منڈی آکر آباد ہو گئے تھے، وہاں بھی میں ان کی خدمت میں سلام عرض کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا۔ حکیم عبداللہ میرے کرم فرما تھے۔ وہ لاہور تشریف لاتے تو مجھے ضرور یاد فرماتے۔ پرانے بزرگوں کی وہ بہت سی باتیں سنایا کرتے تھے۔

حکیم عبداللہ مرحوم کے ہاں روڑی میں ایک صاحب کو دیکھا جو لمبے تڑنگے کڑیل جوان اور متشرع و متواضع بزرگ تھے۔ وہ حکیم صاحب کے مہمان خانے میں کپڑے دھو رہے تھے۔ حکیم صاحب نے تعارف کرایا۔ ان کا نام چودھری نذیر احمد تھا۔ اسی نواح سے غالباً ان کا تعلق تھا۔ دو مضامین میں انھوں نے ایم اے کیا تھا اور نائب تحصیل دار تھے۔ مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر تھے.... چودھری صاحب نے کہا میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں اور خدمت دین کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا آپ کو ملازمت نہیں چھوڑنی چاہیے، نائب تحصیل داری اچھا خاصا منصب ہے، اس پر متمکن رہنا چاہیے۔ افسر نیک نیت ہو تو زیادہ بہتر طریقے سے خدمت دین ہو سکتی ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ملازمت چھوڑ کر خدمت دین کے سلسلے میں، میں نے تین علمائے کرام کو خطوط لکھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو، مولانا سید حسین احمد مدنی کو اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو...! ان سے استفسار کیا کہ مجھے ملازمت ترک کر کے خدمت دین کے لیے وقف ہونا چاہیے یا نہیں؟ مولانا مدنی نے تحریر فرمایا کہ میرے نزدیک انگریز کی ملازمت جائز نہیں۔ مولانا مودودی نے لکھا کہ ملازمت سے استعفا دے کر اقامت دین کی تحریک یعنی جماعت اسلامی میں شامل ہو جاؤ۔ بقول چودھری نذیر احمد کے مولانا ابوالکلام آزاد نے تفصیل سے جواب دیا۔ انھوں نے لکھا کہ آپ کو نائب تحصیل داری کا منصب کسی صورت میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔ معیشت کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں آپ کے گھریلو حالات کیسے ہیں۔ ممکن ہے ترک ملازمت سے معاشی پریشانیاں لاحق ہو جائیں۔ اس وقت کوئی شخص آپ کا معاون نہیں ہو گا، بلکہ الٹا لوگ آپ پر طعنہ زن ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے آپ دیانت دار افسر ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی جگہ کوئی راشی اور بددیانت افسر آ جائے اور لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی جگہ کوئی غیر مسلم لے لے اور مسلمانوں کو اس کے رویے سے تکلیف پہنچے۔ ملازمت چھوڑ دینا خدمت دین کے لیے شرط نہیں، حالت ملازمت میں خدمت دین

زیادہ احسن طریقے سے ہو سکتی ہے اور لوگوں پر اس کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اگر کسی محکمے کا سربراہ دیانت دار ہو، تو ماتحت عملہ بھی آسانی سے بددیانتی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی ایسا افسر آگیا، جس نے لوگوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تو میرے نزدیک اس کی ذمے داری آپ پر بھی عائد ہوگی۔

مولانا نے مزید لکھا کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے اور اس میں رہنے والوں کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے، اگرچہ اس کا کوئی طریقہ ہو، انگریز ملازموں کو جو تنخواہ دیتا ہے، وہ اپنی گرہ سے نہیں دیتا، ہماری ہی کمائی سے دیتا ہے۔ اس میں اچھے لوگوں کو آنا چاہیے۔

اس خط پر چودھری نذیر احمد تعجب کا اظہار کرتے تھے کہ مولانا آزاد انگریز کے اتنے بڑے مخالف ہونے کے باوجود اس کی ملازمت کو جائز ہی نہیں ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے مضبوط دلائل دیتے ہیں، لیکن چودھری صاحب نے ملازمت سے استعفا دے کر جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ملتان میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔ میری ان سے لاہور میں دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔

یہ واقعہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہم دردی اور خیر خواہی ہر آن مولانا کے سامنے رہتی تھی بلکہ یہی ان کا پیمانہ فکر اور مقصد حیات تھا۔

۱۹۸۲ء کے اپریل میں حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ مرحوم دہلی گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دن وہ مولانا کے مزار پر گئے (مزار، میں کہہ رہا ہوں، انھوں نے قبر کہا تھا) وہاں ایک صاحب نہایت عقیدت سے کھڑے دعا مانگ رہے تھے۔ میں نے ان کا نام اور پتا پوچھا تو بتایا کہ وہ نئی دہلی کی مسجد کے خطیب ہیں۔ مولانا آزاد اس مسجد میں جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی نماز فجر میں بھی تشریف لاتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مولانا سے عرض کیا، حضرت آپ کسی دن قرآن مجید کی کسی آیت کا درس ارشاد فرما دیا کریں تو ہم لوگوں کو آپ سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے گا۔

فرمایا: اب ہمارا نہیں، آپ لوگوں کا زمانہ ہے... یہ کہہ کر تشریف لے گئے۔

ان خطیب صاحب کے حوالے سے مولانا عطاء اللہ مرحوم و مغفور نے بتایا کہ ایک بوڑھی عورت سفید برقے میں مولانا کے مزار پر آیا کرتی ہے اور دیر تک یہاں بیٹھی دعا کرتی رہتی ہے... مولانا نے بتایا اتنے میں اتفاقاً وہ عورت آگئی۔ خطیب نے کہا......... "یہ ہے وہ عورت!"

خطیب صاحب نے بتایا کہ اس عورت سے ایک دن میں نے پوچھا: آپ کی مولانا سے کوئی عزیزداری ہے، آپ کو اکثر یہاں بیٹھے اور دعا کرتے دیکھا گیا ہے۔

اس نے کہا: کوئی عزیزداری نہیں۔ جب دہلی میں قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوا تو بے شمار لوگ مولانا کی کوٹھی پر آگئے تھے اور کوٹھی ایک کیمپ کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ان کے خرچ اخراجات مولانا ادا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ حالات ٹھیک ہوتے گئے تو سب لوگ چلے گئے اور سائبان اکھڑ گئے۔ میں اکیلی وہاں رہ گئی۔ ایک دن مولانا نے مجھ سے پوچھا:

"بہن! آپ کون ہیں، اپنے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں۔"

میں نے عرض کیا، جناب میں دہلی کے فلاں علاقے کی رہنے والی ہوں، میرے گھر پر شرنارتھیوں نے قبضہ کر لیا ہے اور میرے دو بیٹے اس ہنگامے میں مر گئے ہیں، اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ اس لیے یہاں بیٹھی ہوں۔

مولانا نے کوشش کر کے مجھے ایک مکان دلا دیا اور میں وہاں چلی گئی۔ میرا پتا انھوں نے ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مولانا میرے کھانے پینے کا سامان اور کچھ روپے بھجوا دیتے تھے۔ میں اس کے لیے ان کے ہاں کبھی نہیں گئی۔ مولانا کے انتقال کے بعد مجھے پریشانی ہوئی اور سوچنے لگی کہ اب کیا ہوگا۔ کچھ دن گزرے تھے کہ ایک شخص آیا اور مجھے وہی کچھ دے گیا جو مولانا دیتے تھے۔ میں نے پوچھا تم کون ہو اور یہ سب کس نے بھیجا ہے؟ اس نے بتایا کہ مولانا بہت سے لوگوں کی اسی طرح مدد کرتے تھے اور ان کے نام اور پتے ان کی ڈائری میں لکھے ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کی ڈائری دیکھی تو یہ ذمے داری انھوں نے قبول کرلی۔ یہ سب چیزیں اور روپے انھی

نے بھیجے ہیں اور ہر مہینے ملتے رہیں گے۔ چنانچہ مولانا نے میری امداد کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ جواہر لال کی موت تک جاری رہا۔

مولانا کی کوٹھی میں ان دنوں جن لوگوں نے پناہ لی تھی، ان کو شمار میں لانا مشکل ہے۔ انجمن ترقی اردو کے رہنما بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی بھی مولانا نے اسوقت مدد کی تھی اور اپنے مکان پر ٹھہرایا تھا، حالانکہ وہ مولانا سے ناراض رہتے تھے۔ اگست ۱۹۹۵ء کے "قومی زبان" (کراچی) میں "مولوی عبدالحق" کے عنوان سے جناب مظفر حسین شمیم صاحب کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے، جس میں مولوی عبدالحق کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو مصرح کیا گیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس جس کا تعلق مولانا آزاد سے ہے، قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں:

> "مولانا ابوالکلام آزاد سے مولوی عبدالحق کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مجھے اچھی طرح علم و اطلاع ہے کہ مولانا آزاد نے انجمن کا ڈائریکٹر بننے کی کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب نے خود انجمن کے مفاد میں مولانا سے درخواست کر کے ان کا نام مجلس نظما میں دیا تھا۔ مولانا آزاد کے مولوی صاحب سے کسی قسم کے ذاتی تعلقات نہیں تھے، لیکن جب مولوی صاحب انجمن لے کر دلی چلے گئے تو جب بھی انھوں نے مولانا آزاد سے انجمن کے لیے کسی قسم کی مدد چاہی، مولانا نے انجمن کی فی سبیل اللہ مدد کی اور تقسیم ہند کے بعد دلی کے ہنگامے میں انجمن کا جو سرمایہ بچ گیا وہ محض مولانا آزاد کی ذاتی کوشش اور شرافت نفسی کا نتیجہ تھا۔ مولوی صاحب نے جب دلی کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد مولانا کے مکان پر قیام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مولانا نے نہایت خندہ پیشانی سے مولوی صاحب کو اپنے مکان پر ٹھہرایا۔"

مولانا آزاد اور مولوی عبدالحق سے متعلق اس بظاہر چھوٹے مگر درحقیقت بہت

بڑے واقعے کے بعد ایک اور واقعہ بھی سنتے جایے، جس کا ذکر ہندوستان کے مشہور ادیب و شاعر جناب جگن ناتھ آزاد نے "قومی زبان" (کراچی) کے اگست ۱۹۹۴ء کے شمارے میں کیا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "۔ مولوی عبدالحق یادوں کے آئینے میں"

"مجھے مولوی (عبدالحق) صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع لاہور میں ملا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے دولت کدے پر ان کا قیام تھا۔ میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ انجمن اردو کی صوبائی شاخ قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں پہنچا تو بہت مصروف تھے۔ اندر بلا تو لیا لیکن زیادہ وقت نہ دے سکے۔ فرمانے لگے شام کو میاں بشیر احمد کی کوٹھی پر آجانا، وہاں ایک بہت اہم جلسہ منعقد ہوگا۔ اسی جلسے میں انجمن کی صوبائی شاخ کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا تھا۔"

یہ اقتباس اس لیے دیا گیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالقادر قصوری کے باہم بڑے مستحکم علائق تھے، مولانا آزاد کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کا ذکر آیا تو ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ مولانا آزاد کے ساتھی مولانا عبدالقادر قصوری سے بھی مولوی عبدالحق کے مراسم تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا قصوری کی وفات ۱۶/ نومبر ۱۹۴۲ء کو ہوئی تھی ......

میاں بشیر احمد سے مراد میاں بشیر احمد ہمایوں ہیں۔ رسالہ "ہمایوں" کے مالک و مدیر۔

مولانا آزاد کی وفات ۲۲/ فروری ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے بڑے بیٹے مولانا محی الدین احمد قصوری کے پاس ان کے بہت سے خطوط تھے، جنھیں ایک فائل میں انھوں نے انتہائی احتیاط اور پیار سے محفوظ کر رکھا تھا۔ یہ معلوماتی اور علمی خطوط تھے۔ مجھ سے ان کی اشاعت کے متعلق انھوں نے مشورہ کیا اور پھر ان کی خواہش کے مطابق ہم دونوں مولانا غلام رسول مہر کے پاس گئے اور مہر صاحب نے مرتب کر کے چند دیگر حضرات کے خطوط کے ساتھ یہ خطوط "تبرکات آزاد" کے نام سے چھپوا دیے۔ اس

سے پہلے مولانا کے جو خطوط مہر صاحب کے نام آئے تھے، وہ "نقش آزاد" کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔

مولانا محی الدین احمد قصوری نے بتایا کہ ایک خط میں انھوں نے مولانا ابوالکلام سے سورۂ ملک کے بارے میں بعض استفسارات کیے تھے۔ مولانا آزاد نے جواب میں چالیس صفحے کا ایک مبسوط مفصل خط لکھا تھا جو سورۂ ملک کی تفسیر پر مشتمل تھا۔ مولانا قصوری فرماتے ہیں اس خط میں مولانا آزاد نے ایسے ایسے تفسیری نکات بیان کیے تھے جو اس سے پہلے نہ کبھی کسی سے سنے تھے، نہ کہیں پڑھے تھے اور نہ ذہن میں آئے تھے۔ یہ نہایت علمی اور تحقیقی خط تھا، لیکن جب انھیں مولانا آزاد سے تعلق کے جرم میں برطانوی حکومت نے گرفتار کر کے دسوہہ (ضلع ہوشیار پور) میں تین سال کے لیے نظر بند کر دیا تو ان کی بیوی نے تمام کاغذات جمع کر کے مکان کی چھت پر رکھ دیے، تاکہ پولیس تلاشی کے لیے آئے تو ان کاغذات کو اٹھا کر نہ لے جائے۔ کئی دن وہ چھت پر پڑے رہے۔ اس اثنا میں آندھی آئی اور تمام کاغذات اڑ گئے، جن میں مولانا کی تحریر فرمودہ سورۂ ملک کی تفسیر بھی تھی۔

مولانا محی الدین احمد قصوری نے اس حادثے کا مجھ سے کئی دفعہ ذکر کیا اور ہر دفعہ اس پر اظہار افسوس فرمایا کرتے تھے کہ مولانا آزاد کی یہ ایک بہت بڑی علمی متاع تھی جو میرے گھر سے ضائع ہو گئی۔ مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا محی الدین احمد قصوری سے مولانا آزاد کے تعلقات و مراسم کی تفصیل راقم کی کتاب "قصوری خاندان" میں بیان کی گئی ہے۔

مولانا ہر سوال یا ہر اعتراض کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور نہ بعض لوگوں کی طرح ہر بات کو اہم قرار دیتے تھے۔ ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم نے ایک دفعہ بتایا کہ میں گونڈہ جیل میں، مولانا کے ساتھ قید تھا۔ ایک دن ایک نوجوان سیاسی قیدی میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں انگریزی کی ایک کتاب تھی جس میں دنیا کے دیگر نظاموں پر کمیونزم کی برتری ثابت کی گئی تھی۔ تمام مذاہب بالخصوص اسلام کو اس میں ہدف تنقید ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ نوجوان اس کتاب کے مندرجات سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اسلام پر اعتراضات

کرنا شروع کر دیے اور اس سلسلے میں اس کتاب کے حوالے دینے لگا۔ میں برداشت نہ کر سکا اور اس سے الجھ پڑا۔ میری اس کمزوری سے اس نے اور فائدہ اٹھایا اور میں جذبات میں آگیا۔ کئی دن بحث و تکرار کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے تنگ آکر کہا کہ مولانا آزاد کے پاس چلتے ہیں اور یہ اعتراضات ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ ہم گئے تو مولانا نے فرمایا:

ہاں! میرے بھائی کیسے آنا ہوا؟

ہم دونوں نے اپنے اپنے اسلوب سے اپنی بات بیان کی۔

فرمایا: اچھا میرے بھائی یہ مسئلہ ہے۔

یہ کہہ کر اس نوجوان سے مخاطب ہوئے اور کہا:

مجھے بھی اس کتاب کے وہ حصے سنایے جو آپ کے درمیان وجہ اختلاف بنے ہیں۔ اس نے وہ حصے پڑھنا شروع کیے، مولانا آرام سے بیٹھے سنتے رہے اور ٹھیک! ٹھیک!! کہتے رہے۔ اور کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے قریب اس سے کتاب سنی۔۔۔۔ پھر فرمایا۔

کل پھر آیے، لیکن وہ پھر نہیں گیا اور اس کے بعد اس موضوع پر اس نے کبھی گفتگو بھی نہیں کی۔ اس طرح میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

مولانا نے مجھ سے کہا: آج کل نوجوان کمیونزم سے متاثر ہیں۔ جس قسم کی بحث ان سے آپ کرتے ہیں، اس سے وہ اور تیز ہوتے ہیں۔ انداز گفتگو بدلا جائے گا تو بات بنے گی۔

ہم "وہابی" ٹھہرے، جب تک اپنے مسلک کی بات نہ کر لیں تسلی نہیں ہوتی۔ "اطمینان قلب" کے لیے اس کا ذکر ضروری ہے، لیطمئن قلبی۔

ایک دن میں نے مولانا داؤد غزنوی مرحوم سے کہا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ مولانا آزاد اہل حدیث تھے اور اہل حدیث کے نزدیک رفع الیدین اور آمین بالجہر سنت ہے، کیا مولانا اس پر عامل تھے؟ (ہماری آج کل کی اہل حدیثیت اسی قسم کے چار پانچ مسائل تک محدود ہے)

۲، ۳ر اپریل ۱۹۵۵ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تیسری سالانہ کانفرنس لائل

پور (حال فیصل آباد) میں منعقد ہو رہی تھی۔ جمعیت کی ورکنگ کمیٹی میں فیصلہ کیا گیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس میں شمولیت اور ایک اجلاس کی صدارت فرمانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ مولانا غزنوی نے تفصیلی خط ان کی خدمت میں تحریر کیا۔ مولانا آزاد نے بذریعہ تار اس کا جواب دیا اور لکھا کہ میں شکر گزار ہوں، آپ نے مجھے جمعیت اہل حدیث کی کانفرنس میں شامل ہونے اور ایک اجلاس کی صدارت کرنے کی دعوت دی، لیکن بہت مصروف ہوں اس لیے شامل نہیں ہو سکتا۔ عدم شمولیت کا مجھے افسوس ہے۔

مولانا کا یہ تار مولانا عبیداللہ احرار نے بطور تبرک اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

اب مولانا کے ان مکتوبات گرامی کے بارے میں چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے ان سطور کے راقم کو ارسال فرمائے تھے۔

۱۹ر اگست ۱۹۴۹ء کو ہفت روزہ ''الاعتصام'' گوجرانوالہ سے جاری ہوا۔ میں اس زمانے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا اور جمعیت کا دفتر لاہور میں شیش محل روڈ پر تھا۔ الاعتصام کے اجرا کے پانچ مہینے بعد فروری ۱۹۵۰ء کو مجھے دفتر کی طرف سے گوجرانوالہ بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی تھے اور مجھے معاون ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے وہاں جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے متعدد اکابر علماء وزعما کو خطوط لکھے اور ان سے ''الاعتصام'' کا تعارف کرایا۔ ان کے نام اخبار بھی جاری کیا۔ جن حضرات نے جو جواب دیے ان میں سے افسوس ہے زیادہ تر ضائع ہو گئے، تاہم چند بزرگوں کے خطوط میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں ایک خط مولانا آزاد کو لکھا، جس میں دو باتیں عرض کی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ''الاعتصام'' آپ کی خدمت میں باقاعدہ پیش کیا جا رہا ہے، دوسرے یہ کہ تفسیر ترجمان القرآن کی تیسری اور آخری جلد کس مرحلے میں ہے اور کب تک اس کے مکمل ہونے کی امید ہے۔

مولانا نے ازراہ کرم جواب سے نوازا اور میرے نام پر مکتوب گرامی ارسال فرمایا۔

الاعتصام" کے متعلق لکھا کہ مجھے پہنچ رہا ہے، میں اسے پڑھتا ہوں... آپ لوگ مثبت انداز میں خدمت دین کر رہے ہیں، میری دعا ہے، اللہ اسے قبول فرمائے... تفسیر ترجمان القرآن کے بارے میں تحریر فرمایا کہ بہت جلد مارکیٹ میں آجائے گی۔

افسوس ہے یہ خط ضائع ہو گیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو میں نے دکھایا تو فرمایا تم خوش قسمت ہو، مولانا نے اپنے قلم سے تمہارے خط کا جواب دیا۔ تفسیر کے متعلق مولانا غزنوی نے کہا کہ مولانا نے یہ تفسیر ابھی تک نہیں لکھی "بہت جلد مارکیٹ میں آجائے گی" سے ان کا مطلب یہ ہے کہ تمام مواد ان کے ذہن میں ہے اور ان کا خیال ہے کہ جب لکھنے بیٹھیں گے، تھوڑے عرصے میں یہ مواد کاغذ پر منتقل کر دیں گے، مگر ان کی مصروفیات اتنی زیادہ اور گوناگوں ہیں کہ اب اس کی تکمیل مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مولانا غزنوی نے فرمایا کہ میں نے تفسیر کے سلسلے میں جب بھی ان سے بات کی انھوں نے یہی جواب دیا:

"بس جلد ہی مکمل ہو جائے گی۔ ذرا مصروفیتیں ختم ہوتی ہیں تو اس طرف متوجہ ہوں گا"۔

لیکن نہ مصروفیتیں ختم ہوں گی اور نہ یہ اہم کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکے گا۔

اس سے چند روز بعد مولانا غلام رسول مہر سے بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ مولانا تفسیر مکمل کر چکے ہیں اور اس کا مسودہ تیار ہے، صرف نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسودے کا کچھ حصہ مولانا نے مجھے خود دکھایا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد مہر صاحب مرحوم کو اصرار تھا کہ تفسیر کا مسودہ مولانا کے بھتیجے نورالدین احمد صاحب کے قبضے میں چلا گیا ہے اور وہ کسی کو نہیں دکھاتے۔ کیوں نہیں دکھاتے؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مہر صاحب بتایا کرتے تھے کہ مولانا کے اور بھی بعض مسودات و تحریرات نورالدین احمد نے چھپا لیے ہیں۔ وہ مولانا کے گھر میں رہتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ مولانا کی کون سی چیز کہاں ہے.... افسوس ہے نورالدین احمد بھی وفات پا گئے۔

ترجمان القرآن کی دوسری جلد سورۂ المومنون کے آخر تک تھی۔ چند سال پہلے اس کے بعد کی سورۂ نور کا مسودہ مولانا کے کاغذات سے مل گیا تھا جو دوسری جلد میں آزاد ساہتیہ اکادمی دہلی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ یعنی اب ترجمان القرآن کی دوسری جلد میں سورۂ نور کی تفسیر موجود ہے۔

ایک حلقے کے بعض حضرات نے ایک زمانے میں مولانا آزاد کی مخالفت کو اپنا فرض منصبی قرار دے رکھا تھا۔ حالاں کہ اس مخالفت کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ میں نے اور مولانا محمد حنیف ندوی نے الاعتصام میں مولانا کا دفاع کیا اور ان کے مخالفین کے حدود علم کا جائزہ لیا۔ اس سلسلے میں ۱۱ر مئی ۱۹۵۴ء کو میں نے مولانا آزاد کو خط لکھا۔ اس خط کا جواب ان کے پرائیویٹ سکریٹری جناب محمد اجمل خاں نے دیا۔ مولانا ان دنوں ۴ کنگ ایڈرورڈ روڈ نئی دہلی میں اقامت گزیں تھے۔ اجمل خاں صاحب نے مجھے ۲۰ر مئی ۱۹۵۴ء کو خط لکھا جو میرے پاس محفوظ ہے اور درج ذیل ہے۔

جناب محترم زیدت الفضائل۔ السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۱۱ر مئی ۱۹۵۴ء حضرت مولانا کو مل گیا۔ جو سلسلہ مضامین آپ نے شروع کیا ہے، وہ بھی ان کی نظر سے گزر رہا ہے۔ مطمئن رہیے۔ بہر حال "گر نبیند بروز شپرہ چشم کے مصداق جو لوگ ہیں، ان کے سامنے یہ کہنا کہ چاند پر خاک ڈالنے سے وہ تاریک نہیں ہو سکتا، بے سود ہے۔ زیادہ۔

والسلام

نیاز مند

محمد اجمل خاں

مولانا مناظر احسن گیلانی مشہور دیوبندی عالم تھے جن کے حدود مطالعہ بہت وسیع تھے۔ انھوں نے دیوبند کے ماہانہ رسالے "دارالعلوم" میں ایک سلسلہ مضمون شروع کیا تھا جس کا عنوان تھا "احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن"۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۱ء میں شروع کیا گیا

تھا جو ۱۹۵۴ء تک جاری رہا تھا۔ اس کی ایک قسط میں بتایا گیا ہے کہ جب ندوۃ العلما (لکھنؤ) سے مولانا شبلی کی علیحدگی کا واقعہ پیش آیا تو ندوہ کے طلبا نے احتجاجاً ہڑتال کر دی تھی اور تمام ہندوستان کے علمی حلقوں میں ایک شور بپا ہو گیا تھا۔ ان دنوں دہلی میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ملک کے بہت سے علما و زعما جمع ہوئے تھے، جن میں دیوبند، علیگڑھ اور ندوہ سے تعلق رکھنے والے حضرات بھی شامل تھے، اس مجلس میں جو وفد دار العلوم دیوبند سے دہلی بھیجا گیا تھا، اس میں خود مولانا مناظر احسن شامل تھے۔ مولانا ابوالکلام بھی اس مجلس میں شریک تھے۔

اس سے آگے مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ ملاحظہ ہوں جن سے مولانا ابوالکلام کے فقہی مسلک کا پتا چلتا ہے۔

''ندوہ کے اسی ''یوم مشہود'' کے سلسلے میں جو ایک واقعہ پیش آیا تھا، قریب قریب چالیس سال گزر جانے کے بعد آج بھی اس کی یاد تازہ ہے۔ مطلب یہ ہے جیسا کہ عرض بھی کر چکا ہوں کہ اس تقریب میں یہ اتفاق کی بات تھی کہ ایک طرف دیوبند کے علما اور دوسری طرف علی گڑھ کے زعما کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید ان دونوں طبقات میں برزخی حیثیت کہیے یا اعرافی مقام کے مالک، ندوہ کے فضلا یا سفرا اس کا کام انجام دے رہے تھے۔

بڑے چھوٹے سب ہی سمٹ سمٹا کر ملک کے مختلف گوشوں سے جمع ہو گئے، یہ وہ زمانہ تھا کہ ''الہلال'' مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی مجلّہ غراء نکل چکا تھا، الہلال کے توسط سے دل کا ایک خاص تعلق مولانا کی ذات سے قائم ہو چکا تھا۔ دلی پہنچنے کے بعد سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ کسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات و مکالمہ کا موقع مل جائے۔ حق سبحانہ وتعالیٰ نے اس دشوار مسئلے کو آسان کر دیا۔ بغیر کسی سابقہ تعارف کے حکیم اجمل خان مرحوم کے مکان میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ مولانا کے ریعان شباب کا زمانہ تھا۔ سیاہ کمانی کی عینک اور سر پر کافوری عمامہ اس زمانہ میں باندھا کرتے تھے۔ فقیر اپنے ٹھیٹھ دیوبندی بانے میں حاضر ہوا تھا، سر پر سفید صافہ، لمبا کرتا، خالص دیوبند کا ایک طالب علم۔

مگر ملنے کے ساتھ ہی مولانا غیر معمولی طور پر متوجہ ہو گئے، تا آں کہ عصر کے بعد سے مغرب تک مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے رہے، یہی اپنی زندگی میں مولانا سے پہلی ملاقات تھی اور شاید یہی آخری ملاقات بھی۔

مغرب کی نماز مولانا کے ساتھ ہی حکیم جی مرحوم کی مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی گئی۔ نماز میں ایک خاص لطیفہ پیش آیا۔ فرض میں میں نے دیکھا کہ مولانا نے "رفع الیدین" نہیں کیا۔ لیکن سنت میں انہی کو "رفع الیدین" کرتے ہوئے جب میں نے پایا تو مسجد سے نکلتے ہوئے وجہ دریافت کی گئی۔ مولانا مسکرائے اور فرمانے لگے کہ جناب یہ بھی احادیث کی تطبیق کی ایک شکل ہے، دیوبند میں یہ توجیہ آپ نے نہ سنی ہو گی۔ پھر ایک تقریر کی جس کا حاصل غالباً یہی تھا کہ احادیث سے رفع و عدم رفع دونوں باتیں ثابت ہیں، ایک مقدمہ تو یہ، ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مکتوبات یعنی فرض نمازوں اور سنن و نوافل کا منجملہ دوسرے امتیازات و فروق کے ایک فرق یہ بھی ہے کہ سنن و نوافل میں گونہ حرکات کی گنجائش ہے، جن کا تحمل فرائض نہیں کر سکتے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ رفع و عدم رفع میں ظاہر ہے کہ رفع کا تعلق حرکت سے ہے اور عدم رفع میں سکون ہے۔

انہی تینوں مقدمات کو پیش نظر رکھ کر مولانا نے فرمایا کہ سنن و نوافل میں تو میں رفع الیدین کرتا ہوں، لیکن فرائض میں بعض اوقات نہیں کرتا۔"

اس کے بعد مولانا گیلانی فرماتے ہیں، واقعی مولانا کی طرف سے مسئلہ رفع الیدین کی یہ نئی توجیہ تھی، جو اس وقت کان میں پڑی تھی، اور اس وقت تک کسی کتاب میں باوجود طویل مطالعہ کے یہ توجیہ نظر سے نہیں گزری۔

سیاسیات میں مولانا کا جو نقطہ نظر تھا، ذاتی طور سے تو بلا شبہ اس پر وہ سختی سے پابند تھے، لیکن ہر شخص کو اسے اختیار کرنے کی دعوت نہیں دیتے تھے، بلکہ بعض لوگوں کو اپنے سیاسی مسلک کے بالکل الٹ عمل کی تلقین فرماتے تھے۔ اس ضمن کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف مرحوم نے سنایا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ مولانا نے صوبہ سرحد جاتے ہوئے ایک دن کے لیے لاہور میں قیام کیا۔ لاہور سے مولانا پشاور کے لیے ریل میں سوار ہوئے تو وہ (شیخ صاحب) بھی اس میں بیٹھ گئے، وہ مولانا سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ ہمیں کس سیاسی جماعت میں شامل ہو کر کام کرنا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے فوراً جواب دیا، مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کی خدمت کیجیے۔

سیاسیات میں مولانا کے کچھ اصول تھے، جو ہر وقت ان کے پیش نگاہ رہتے تھے اور جن پر وہ عامل تھے، جس طرح وہ خود اپنے اصولوں کو ترک نہیں کرنا چاہتے تھے، اسی طرح دوسروں کے اصولوں کا بھی احترام کرتے تھے۔ میاں محمود علی قصوری بیرسٹری پاس کر کے آئے تو ان کے رجحانات مسلم لیگ کی طرف تھے۔ مولانا لاہور تشریف لائے اور مولانا عبدالقادر قصوری کے مکان پر قیام فرما ہوئے۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ وہ محمود علی کو مسلم لیگ سے الگ رہنے کے لیے کہیں۔

مولانا نے فرمایا: سیاسیات میں نوجوانوں کا راستہ نہیں روکنا چاہیے، جس طرف وہ اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں جانا چاہتے ہیں، جائیں۔ ساتھ ہی میاں محمود علی کو مخاطب ہو کر فرمایا آپ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں چنانچہ میاں صاحب کہا کرتے تھے کہ وہ مولانا آزاد کے کہنے سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔

یہاں میں مولانا کے سیاسی اصول کے بارے میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ جب سے وہ کانگریس میں شامل ہوئے، ہمیشہ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے بلکہ دو مرتبہ اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ ایک مرتبہ ۱۹۲۳ء میں دوسری مرتبہ ۱۹۴۰ء میں۔ ۱۹۳۹ء میں قائم مقام صدر بھی بنائے گئے۔ یہ تینوں مواقع ملکی سیاست میں نہایت اہم تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک وہ مسلسل چھ سال صدر رہے۔ آل انڈیا کانگریس کی تاریخ میں صدارت کا یہ سب سے طویل دور ہے جو مولانا

کے حصے میں آیا۔ برصغیر کی سیاست میں یہ زمانہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا اور ملک اس وقت بے حد نازک مراحل سے گزر رہا تھا۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن یہاں آیا جس سے مولانا نے صدر کانگریس کی حیثیت سے گفتگو کی۔ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں ان کی صدارت میں کانگریس نے "کوئٹ انڈیا" (ہندوستان خالی کرو) ریزولیوشن پاس کر کے برطانوی حکومت سے فیصلہ کن ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے نتیجے میں انھیں ۹/اگست کی شب کو گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں قید کر دیا گیا۔ تقریباً تین سال کے بعد ۱۵/جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے تو جون ہی کے مہینے میں شملہ کانفرنس شروع ہو گئی، اس میں شرکت فرمائی اور آزادیٔ ملک کے سلسلے میں کانگریس کا نقطہ نظر پیش کیا۔ پھر اپریل، مئی اور جون ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن سے بات چیت کا طویل سلسلہ چلا۔ ۱۵/جنوری ۱۹۴۷ء کو آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیر تعلیم مقرر کیے گئے۔

اس سے قبل بالکل ابتدائی زندگی میں مختلف اوقات میں کئی رسائل و جرائد جاری کیے۔ متعدد کے ایڈیٹر رہے۔ زندگی کے ماہ و سال میں اضافہ ہوا تو گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی دفعہ گرفتار ہوئے اور دس سال جیلوں میں رہے۔ بہت سی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے اجلاسوں کی صدارت کی۔ ان سب امور کی تفصیلات اردو اور انگریزی کی بہت سی کتابوں میں درج ہیں اور سیاسی و علمی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے چھوٹے بڑے تمام گوشوں سے آگاہ ہیں، لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اس کے باوجود مولانا کم آمیز ہیں اور عام میل جول اور عوامی جلسوں اور اجتماعوں میں شریک ہونے سے گریز فرماتے ہیں۔

تقریر و تحریر میں پورے ہندوستان میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ علم و فضل میں بھی وہ اونچے مقام پر فائز تھے اور سیاسیات میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ان کے بارے میں بے شمار کتابیں چھپی ہیں اور روز بروز چھپ رہی ہیں۔ ان کے افکار و خیالات اب نکھر کر لوگوں کے سامنے آرہے ہیں اور لوگ نہایت دلچسپی سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ برصغیر میں جتنا کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا

ہے، کسی مذہبی اور سیاسی رہنما کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی کم آمیزی اور عوام میں آنے سے گریز نے ان کی سیاسی زندگی کو بے حد نقصان پہنچایا۔ ایک طرف وہ ایڈیٹر ہیں، مصنف ہیں، محقق ہیں، مقرر ہیں، عالم دین ہیں، سیاسی لیڈر ہیں، ادیب ہیں، لیکن دوسری طرف یہ حالت ہے کہ عوام سے دور رہتے ہیں۔ اگر وہ دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح عوام میں آتے اور کھل کر اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے رکھتے تو آزاد برصغیر کا سیاسی نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اتنے بڑے سیاست دان کا عوام سے دور رہنا اور لوگوں سے کم آمیزی اختیار کیے رکھنا اور اسے اصول قرار دینا، سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ مولانا کو اس طرف توجہ بھی دلائی گئی اور بعض اہم شخصیتوں نے اس طرز عمل پر نہایت ادب کے ساتھ نظر ثانی کی درخواست کی، مگر وہ اپنے انداز فکر میں تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ نظر ثانی کی درخواست کرنے والے حضرات میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو اس دور میں ان سے قریب تر تھے۔

اس ضمن میں چند باتیں ملک نصر اللہ خان عزیز کی زبانی سنیے! وہ اپنی کتاب ''زندگانی کی گزر گاہوں میں'' کے صفحہ ۷۹ پر لکھتے ہیں۔

> ''مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے جو اسوقت کانگریسی علما کے پنجاب میں سرخیل تھے، مولانا سے عرض کیا کہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کرنے کے لیے اپنی کم آمیزی میں کمی کریں۔ مولانا نے ساری بات سن کر اپنے انداز خاص میں ایک آہ بھری اور کہا: ''میرے بھائی میں اصولوں کا آدمی ہوں، اگر کسی شخص کو میری رائے سے اتفاق ہے تو میں اس کا شکر گزار ہوں اگر نہیں تو کوئی شکایت نہیں، کوئی شکایت نہیں، کوئی شکایت نہیں۔''

اس سے آگے ملک صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ جس بات پر زور دینا چاہتے تھے، اس کو تین مرتبہ دہراتے تھے۔ اور ''کوئی شکایت نہیں'' کا جملہ انھوں نے تین مرتبہ دہرایا اور اپنے استغنا کا نقشہ

کھینچ دیا، اور محسوس کرادیا کہ قوم میں محبوبیت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے طرز عمل میں تغیر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی قیادت کے معاملے میں ان کی ناکامی کی اصل وجہ ان کا یہی طرز عمل تھا۔

مولانا نہایت بلند حوصلہ اور بدرجہ غایت صابر و ضابط تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان کے خلاف لکھا اور ان پر شدید تنقید بلکہ تنقیص کی، مگر انھوں نے کبھی کسی کا جواب نہیں دیا، بلکہ ان کی کوشش رہی کہ کوئی اور بھی ان کا دفاع نہ کرے۔ ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ جماعت اسلامی کے ایک رکن ماہر القادری مرحوم نے اپنے ماہانہ رسالے "فاران" میں مولانا کی زندگی کے بعض گوشوں پر لکھنا اپنے آپ پر فرض قرار دے لیا تھا۔

۱۹۵۲ء میں ہندوستان کے مشہور محقق و مصنف جناب مالک رام صاحب کراچی آئے تو ماہر صاحب نے ان کو فاران کے کچھ رسالے دیے اور ایک مضمون کے بارے میں جو مولانا کے خلاف لکھا تھا، کہا کہ یہ خاص طور پر آپ کے دیکھنے کا ہے۔

ماہر صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر مالک رام صاحب دہلی میں مولانا کی خدمت میں گئے اور ان سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ معلومات حاصل کرنے کی وجہ بتائی اور اس سلسلے میں مضمون لکھنے کا خیال ظاہر کیا تو بقول مالک رام کے مولانا نے ان سے فرمایا:

"کیا آپ کے پاس کرنے کو کوئی اور کام نہیں کہ آپ کو لوگوں کے اعتراضات کا جواب لکھنے کی سوجھی ہے۔ یہ بالکل فضول اور بیکار کام ہے۔ اگر معترض نے کوئی صحیح بات لکھی ہے تو اپنی اصلاح کر لیجیے اور اگر غلط لکھا ہے تو اس سے درگزر کیجیے۔ اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا اور تلخی میں اضافہ نہیں ہوگا۔ اس سے جو وقت بچے گا، اس میں کوئی اور مفید کام کیجیے۔"

مالک رام کہتے ہیں، مولانا نے جواب لکھنے سے سختی سے منع کر دیا اور ان کا یہ فرمان زندگی کے لیے میرا رہنما اصول بن گیا۔

یہاں مولانا آزاد کی تقریر کے بارے میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ایک

دلچسپ لطیفہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے جو مولانا غلام رسول مہر کے حوالے سے ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے اپنی تصنیف "مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت" کے صفحہ ۴۷ پر نقل کیا ہے۔ مہر صاحب بیان فرماتے ہیں۔

مولانا (آزاد) نے پہلی مرتبہ انجمن (حمایت اسلام لاہور) کے سالانہ اجلاس میں تقریر فرمائی تھی تو وہ عمر کی سولہویں منزل میں تھے۔ اس زمانے میں انجمن کے اسٹیج پر ممتاز اصحاب علم و فن کو بھی بہ مشکل بار ملتا تھا۔ یہ تقریر اتنی مسلسل، مربوط اور عام تقریروں سے بہ ہر لحاظ اتنی مختلف تھی کہ مولانا ثناءاللہ مرحوم و مغفور نے فرمایا:

"ہم تو تھے پسنجر ٹرین، ہمارے بعد کلکتہ میل آرہی ہے۔"

اس زمانے میں کلکتہ میل کو رفتار کی تیزی اور ہنگامہ خیزی کے باعث تمام ٹرینوں پر بہ درجہا فوقیت حاصل تھی۔ مولانا آزاد کے وطن کی نسبت سے "کلکتہ میل" کے ساتھ تشبیہ میں جو لطف تھا، وہ تشریح سے بے نیاز ہے۔

مہر صاحب کہتے ہیں "یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ تھا۔ آئندہ سال مولانا دوسری مرتبہ انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۰۵ء میں شریک ہوئے۔ ۲۲/اپریل کو انھوں نے تقریر فرمائی۔ اس کا موضوع تھا "اسلام زمانہ آئندہ میں" اس وقت مولانا سترہویں سال میں تھے۔ یہ تقریر اسقدر پسند کی گئی کہ صدر اجلاس نے حاضرین کو خوش خبری سنائی "آزاد کل پھر تقریر کریں گے"..... چنانچہ ۲۳/اپریل کو مولانا نے دوبارہ تقریر کی۔ انجمن کی روداد مظہر ہے کہ تقریر پر صدر اجلاس نے لیکچرار کی خوش بیانی کی داد دی اور ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کی"۔

مشاہیر کے حالات و سوانح اور واقعات و کوائف کے سلسلے میں مولانا کے مکتوبات کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہمارے دور کے اکابر کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبدالماجد دریابادی اور دیگر بہت سے حضرات کے مکتوبات گرامی نہایت اہتمام سے جمع کیے گئے اور شائع ہو کر

شائقین کے علم و مطالعہ میں آئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات بھی متعدد اصحاب کی سعی و کوشش سے اشاعت پذیر ہوئے اور لوگوں نے دلچسپی سے ان کا مطالعہ کیا۔ ان اکابر کے کتنے ہی ایسے مکتوبات ان کے عقیدت مندوں کی تحویل میں ہوں گے جو ابھی کسی کتاب یا رسالے یا مجموعے میں نہیں چھپے ہوں گے۔ آئندہ سطور میں مولانا ابوالکلام آزاد کے پانچ مکتوبات پیش خدمت ہیں ان کے مطالعہ سے پہلے چند تمہیدی الفاظ پڑھ لیجیے۔

ستمبر ۱۹۸۳ء میں مجھے بہاول پور سے جناب محمد کامران فاروقی صاحب کا خط موصول ہوا، جس میں لکھا تھا کہ مولوی فضل محمد ۲۶/ جولائی ۱۹۸۳ء کو انتقال کر گئے ہیں۔ ان کے نام ''المعارف'' آتا تھا، ان کی مدت خریداری ختم ہونے کے بعد انکے نام رسالہ نہ بھیجا جائے۔

محمد کامران فاروقی نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ مولوی فضل محمد (سابق ریاست) بہاول پور میں سول جج تھے اور ان کے والد مولوی فیض محمد ڈسٹرکٹ جج تھے۔ مولوی فضل محمد نے بہاول پور کے محلہ قاضیان میں جہاں وہ سکونت پذیر تھے، ایک لائبریری قائم کی تھی جس کا نام اپنے باپ کے نام کی نسبت سے الفیض لائبریری رکھا تھا۔ یہ لائبریری کئی ہزار کتابوں پر مشتمل ہے، جس میں بہت سی نایاب کتابیں، سیکڑوں کی تعداد میں پرانے رسائل و جرائد، متعدد مشاہیر اہل علم کے غیر مطبوعہ خطوط اور تقریباً ایک سو قلمی کتابیں موجود ہیں۔ یعنی یہ لائبریری نوادر و نایاب یا کم یاب اشیا کا دل آویز مجموعہ ہے۔

انھوں نے خط میں وضاحت کی تھی کہ مولوی فضل محمد کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے، وہ ان کے بھانجے ہیں اور کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ فارغ وقت میں وہ لائبریری کی کتابیں ترتیب دیتے ہیں اور ان مختلف رسائل مکتوبات کو جو بکھرے پڑے ہیں ایک جگہ جمع کر رہے ہیں اور ان کی گرد و غبار جھاڑ کر الگ الگ مرتب کرنے کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔

اپنے خط میں انھوں نے اشارہ کیا تھا کہ وہ یہ لائبریری اور تمام مکتوبات و رسائل

کسی علمی ادارے کو دینا چاہتے ہیں تاکہ اہل علم اس سے مستفید ہو سکیں۔

انھوں نے بتایا تھا کہ مکتوبات کے اس مجموعے میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان) مولانا حسرت موہانی، مولانا غلام رسول مہر اور دیگر بہت سی مشہور شخصیتوں کے خطوط موجود ہیں اور یہ وہ خطوط ہیں جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔

انھوں نے لکھا تھا کہ اگر آپ "المعارف" میں ان مکتوبات میں سے کسی بزرگ کا کوئی مکتوب چھاپنا چاہیں تو اس کی فوٹو کاپی بھیج دی جائے گی۔

کامران فاروقی صاحب کا یہ خط پڑھ کر مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ تھے میں نے یہ خط ان کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کی کہ کسی اہل علم کو بہاول پور بھیج کر الفیض لائبریری کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں اور اس ذخیرۂ علمی کو ادارے میں منتقل کرنے کی سعی کی جائے لیکن افسوس ہے میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ یہ ہوا کہ میں نے کامران صاحب سے خط و کتابت جاری رکھی اور ان سے بعض مشاہیر کے خطوط کی فوٹو کاپیاں حاصل کر لیں اور پھر یہ خطوط "المعارف" کے دسمبر ۱۹۸۳ء.... فروری، مارچ ۱۹۸۴ء اور اپریل، مئی ۱۹۸۵ء کے شماروں میں شائع کیے گئے۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں مجھے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی طرف سے خط آیا کہ میں یکم جنوری ۱۹۸۵ء کو وہاں پہنچوں اور ایم اے کے بعض مضامین کا زبانی امتحان لوں۔ سفر سے میں بہت گھبراتا ہوں، لیکن وہاں پہنچا، زیادہ تر باعث کشش الفیض لائبریری تھی۔ یونیورسٹی کے مہمان خانے میں سامان رکھتے ہی اپنے عزیز دوست ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر کی معیت میں محلہ قاضیاں گیا۔ پرانے دور کی تنگ سی گلی میں داخل ہوتے ہی ایک مکان پر الفیض لائبریری کا چھوٹا سا بورڈ نظر آیا۔ دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان باہر آئے۔ تعارف ہوا تو پتا چلا کہ

محمد کامران فاروقی یہی ہیں۔ وہ بھی مل کر خوش ہوئے اور مجھے بھی ان سے مل کر نہایت مسرت ہوئی۔ پر تکلف چائے پلائی۔ لائبریری کا ذکر چھڑا تو معلوم ہوا کہ دو دن پہلے لائبریری زاہد ملک صاحب نے خرید لی ہے اور وہ نوادر کا تمام ذخیرہ صادق آباد لے گئے ہیں۔

مختلف ذرائع سے پتا چلا کہ مولوی قاضی فضل محمد جو بعد میں محمد فضل اللہ کہلانے لگے تھے، بے حد علمی ذوق کے مالک تھے۔ نہایت شریف النفس اور بڑے ہی نیک طینت بزرگ تھے۔ پرانی کتابیں، رسائل و جرائد اور مشاہیر کے خطوط جمع کرنے کا انھیں انتہائی شوق تھا۔ کسی بڑے آدمی کا جو خط کہیں سے ملتا، قبضے میں کر لیتے، اس طرح ان کے ذخیرۂ نوادر میں بہت سے خطوط جمع ہو گئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے انھیں بہ درجہ غایت عقیدت تھی اور ان کا ذکر وہ بہت ہی احترام سے کرتے تھے۔ مولانا سے ان کی خط و کتابت بھی تھی، مولانا بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ان کے پر خلوص جذبات کی قدر کرتے تھے۔ ان کے ذخیرۂ مکتوبات سے ان کے بھانجے محمد کامران فاروقی صاحب نے مختلف اوقات میں مولانا کے پانچ مکتوبات مجھے بھیجے تھے جو میں نے "المعارف" کے ان شماروں میں شائع کیے، جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ جی چاہتا ہے، یہ خطوط یہاں بھی شائع کر دیے جائیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ کتابی شکل میں محفوظ ہو جائیں گے۔ دوسری وجہ یہ کہ جن حضرات کے نام یہ خطوط لکھے گئے تھے، "المعارف" میں ان میں سے بعض کا انتساب صحیح نہیں لکھا جا سکا تھا۔ پھر ان میں جن بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کا تعارف بھی کما حقہ نہیں کرایا جا سکا تھا۔ بعد میں جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کی روشنی میں یہاں مکتوب الیہم کے اصل نام بھی لکھے جا رہے ہیں اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا جا رہا ہے، نیز جن شخصیتوں کا ان میں ذکر ہوا ہے، ان کے بارے میں بعض ضروری باتیں درج کی جا رہی ہیں۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جب یہ خطوط "المعارف" کے چند شماروں میں شائع ہوئے تو ہمارے دوست ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری نے ایک مکتوب کے ذریعے ان

حضرات کی نشان دہی کی جن کے نام مولانا نے یہ خطوط تحریر فرمائے تھے۔اس کی اطلاع خود مولوی محمد فضل اللہ (معروف بہ فضل محمد) نے ڈاکٹر ابو سلمان کو بذریعہ خط و کتابت دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو انھوں نے ان میں سے بعض مکتوبات کی نقل بھی بھجوائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان مکتوبات کے سلسلے میں بعض ضروری امور سے مطلع فرمایا:

یہ پانچوں خطوط مندرجہ ذیل تاریخوں کے تحریر فرمودہ ہیں۔

(۱) ۱۸ر فروری ۱۹۳۷ء

(۲) ۱۹ر جون ۱۹۳۷ء

(۳) ۲۴ر اگست ۱۹۳۸ء

(۴) ۱۷ر اگست ۱۹۳۹ء

(۵) ۱۶ر جولائی ۱۹۴۵ء

ان میں سے پہلا خط جو مولانا نے ۱۸ر فروری ۱۹۳۷ء کو تحریر فرمایا مولوی قاضی فضل محمد (محمد فضل اللہ مرحوم) کے دوست چودھری حفیظ اللہ صاحب کے نام ہے۔ وہ اصلاً سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور بہاول پور کے صادق دین ہائی اسکول میں ماسٹر تھے، مولانا عبدالعزیز کے، جن کا اس خط میں ذکر ہوا ہے، رفقا میں سے تھے۔ تحریک خلافت کے سرگرم اور فعال رکن تھے، ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے علمائے کرام نے ترک موالات کا جو فتویٰ دیا تھا، اس سے متاثر ہو کر چودھری حفیظ اللہ نے اسکول کی سرکاری ملازمت سے استعفاد ے دیا تھا اسی زمانے میں مولانا عبدالعزیز اور ماسٹر حفیظ اللہ بہاول پور سے کلکتے گئے اور دونوں نے تحریک نظم جماعت کے سلسلے میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی۔

تحریک خلافت کے ختم ہونے کے بعد ترک موالات کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا

اور ماسٹر حفیظ اللہ نے دوبارہ اسکول کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ بعد ازاں ترقی کر کے وہ اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے اور پھر اسی منصب سے ریٹائر ہو کر پنشن حاصل کی۔

مولانا عبدالعزیز کا شمار ریاست بہاول پور کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ ادب و انشا اور تصنیف و تالیف میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب "صبح صادق" ہے، جس میں ریاست بہاول پور کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ "العزیز" نام کا ایک ماہانہ رسالہ بھی انھوں نے جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔

مولانا عبدالعزیز کچھ عرصہ سرکاری ملازمت بھی کرتے رہے۔ ریاست بہاول پور میں ضلع دار کے عہدے پر فائز تھے۔ ترک موالات کا فتویٰ شائع ہونے کے بعد سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ استعفے میں لکھا تھا کہ:

ریاست بہاول پور کا انتظام کونسل آف ریجنسی کے ہاتھ میں ہے جو انگریزی حکومت کی نمائندہ ہے اور موجودہ حالات میں انگریز کی ملازمت جائز نہیں، لہٰذا میں ریاست کی نوکری سے مستعفی ہوتا ہوں"۔

بہاول پور کی عدالت کا قادیانیوں سے متعلق ایک مقدمہ بہت مشہور ہے۔ اس میں مولانا عبدالعزیز کو خاص تعلق تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ ماسٹر حفیظ اللہ کے ایک بھائی محمد شفیع تھے۔ یہ دونوں بھائی اور مولانا عبدالعزیز ریاست بہاول پور میں سیاسی خدمات کے علاوہ معاشرتی اور اصلاحی و رفاہی خدمات بھی سرانجام دیتے رہے۔ جمعیت المسلمین (۱۹۲۵ء) انجمن خدام الدین (۱۹۳۲ء) اور جماعت حزب اللہ (۱۹۳۴ء) کے سلسلے میں ان کی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے۔

مولانا عبدالعزیز نے پینسٹھ سال کی عمر پا کر ۲۶ر جون ۱۹۴۸ء کو بہاول پور میں انتقال کیا۔ ان کے والد کا اسم گرامی شیخ اللہ بخش تھا۔ وہ ریاست بہاول پور میں تحصیلدار تھے۔

اب مولانا آزاد کا وہ خط ملاحظہ فرمایئے جو انھوں نے ۱۸ر فروری ۱۹۳۷ء کو ماسٹر

چودھری حفیظ اللہ کے نام ارسال فرمایا تھا۔اس خط میں قرآن مجید کی جو دو آیتیں مولانا نے لکھی ہیں، حاشیے میں ہم نے ان کا پورا حوالہ اور ترجمہ دے دیا ہے۔

یہ مولانا کے ان پانچ خطوط میں سے جو مجھے الفیض لائبریری کے ذخیرہ مخطوطات سے جناب محمد کامران فاروقی صاحب نے بھیجے تھے، پہلا خط ہے۔

(۱)

کلکتہ

۱۸۔۲۔۷ ۱۹۳ء

عزیزی خط پہنچا اور مولوی عبدالعزیز صاحب کے سفر حج کا حال معلوم ہوا، اللہ تعالیٰ ان کا یہ عمل خیر قبول فرمائے اور خیر وعافیت کے ساتھ گھر واپس پہنچائے۔

اپنے کام میں لگے رہیے اور اتار چڑھاؤ سے افسردہ خاطر نہ ہوئیے۔ان شاء اللہ آپ کی راہ محمود ہے۔اپنے کو روشنی میں پائیں گے، تاریکی سے دوچار نہ ہوں گے۔

اس راہ میں عارضی انقباض ناگزیر ہے، بعض اوقات خطرات و وساوس کا ہجوم بھی بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور قلبی حالت متزلزل ہونے لگتی ہے، لیکن اگر طبیعت میں چونک اٹھنے اور متنبہ ہو جانے کی قوت برابر کام کر رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نتیجے کی طرف سے اندیشہ لاحق ہو۔جوں جوں تنبہ کی قوت بڑھتی جائے گی، وساوس کا استیلا کم زور ہوتا جائے گا۔

اصل کار اس راہ میں یہ ہے کہ نفس امارہ کی قہر و سلطانی سے نجات حاصل ہو جائے اور نفس لوامہ بیدار ہو جائے۔یہ حالت اگر حاصل ہو گئی ہے تو پھر نفس مطمئنہ کا مقام دور نہیں۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نزغات و وساوس بالکل معدوم نہیں ہو جا سکتے۔جو بات مطلوب ہے، وہ ان کا معدوم ہو جانا نہیں ہے، بلکہ ان کے مقابلے میں تنبہ و تذکر کی قوت کا پیدا ہو جانا ہے۔یہی وجہ ہے کہ متقی انسانوں کی یہ علامت بتلائی کہ:

اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔(۱)

اور غافلوں کا حال یہ ہوا کہ:

وَاِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ۔(۲)

بہر حال اپنی طلب و سعی میں سرگرم رہیں۔ان شاء اللہ روز بروز اپنے کو بہتر عالم میں پائیں گے۔والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔

ابوالکلام کان اللہ لہ

مکتوب مورخہ ۱۹؍جون ۱۹۳۷ء چودھری حفیظ اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی چودھری محمد شفیع سیالکوٹی کے نام ہے۔محمد شفیع صاحب بھی بہاول پور میں مقیم تھے اور وہیں کے پتے پر حضرت مولانا آزاد کا یہ خط آیا تھا۔

یہ دونوں بھائی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا، حضرت مولانا آزادؒ سے عقیدت رکھتے تھے اور قاضی محمد فضل اللہ مرحوم سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔لیکن ذوق علمی میں قاضی صاحب کا مرتبہ ان سے بہت بلند تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ قاضی صاحب نے ان سے یہ خطوط لے کر اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے۔

(۲)

کلکتہ

۱۹۔۶۔۱۹۳۷ء

عزیزی خط پہنچا۔اللہ تعالیٰ طمانیت قلب کی دولت سے مالامال فرمائے۔آپ کے

(۱) یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۰۱ ہے۔پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: جو لوگ متقی ہیں، اگر انھیں شیطان کی وسوسہ اندازی سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چونک اٹھتے ہیں، اور پھر (پردۂ غفلت اس طرح ہٹ جاتا ہے کہ گویا) اچانک ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

(۲) یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۰۲ ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے: مگر جو لوگ شیطانوں کے بھائی بند ہیں تو انھیں وہ گمراہی میں کھینچے لیے جاتے ہیں اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے۔

اقربا نے ملازمت کی جو راہ نکالی ہے، بہتر ہے کہ اس سے گریز نہ کریں۔اس کے لیے ساعی

ہوں اور ملے تو اختیار کرلیں۔ معیشت کے بارے میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وقت اور حالات کے تقاضے کا ساتھ دیا جائے۔ علاوہ بریں اگر والدین مصر ہیں، تو ضروری ہے کہ ان کی خواہش کی تعمیل کی جائے۔

باقی تمام معاملات دل اور نیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر حال میں رہ کر ایک طالب سعادت اپنے باطن کی نگرانی کرسکتا ہے۔

آپ کی بھاوج کی علالت کی خبر معلوم ہوئی، اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمائے، دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فقیر ابوالکلام

مکتوب مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۳۸ء مولوی قاضی فضل اللہ صاحب کے نام ہے۔ اس خط میں مولانا عبدالعزیز کا ذکر آیا ہے۔ ان دونوں حضرات کا تعارف گزشتہ سطور میں کرایا جاچکا ہے۔

اس خط کے آخر میں قرآن مجید کی ایک آیت کا جو ٹکڑا مولانا نے درج فرمایا ہے، اس کا حوالہ اور ترجمہ ہم نے حاشیے میں دے دیا ہے۔

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حبی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ خط پہنچا۔ آپ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالعزیز صاحب کسی وجہ سے ناراض ہیں اور میں اس بارے میں انھیں لکھوں۔ مجھے معلوم نہیں آپ میں اور ان میں رنجش کے اسباب کیا ہیں؟ لیکن بہر حال دو مسلمانوں میں اصل معاملہ صلح و صفائی ہے نہ کہ رنجش و نااتفاقی۔ آپ میرا یہ خط ان کے پاس بھیج دیجیے۔ اگر آپ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو چاہیے آپ اس کا اعتراف کریں اور وہ اسے خوش دلی کے ساتھ معاف

کر دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ایک مسلمان کی طرف سے ہر گز بلا وجہ اپنا دل مکدر نہ رکھیں گے۔ وَالعَاقِبَۃُ لِلمُتَقِینِ۔(۱)

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

کلکتہ ۲۴۔ اگست ۱۹۳۸ء

جواب کے لیے ٹکٹ کی ضرورت نہ تھی،

جواب دینا اخلاقی فرض ہے۔

یہ خط بھی مولوی فضل محمد مرحوم کے نام ہے، جو مولانا نے ۱۷ ر اگست ۱۹۳۹ء کو بذریعہ رجسٹری کلکتہ سے ارسال فرمایا۔ اس کے لفافے پر اردو اور انگریزی میں مکتوب الیہ کا جو پتا لکھا گیا ہے، وہ بھی یہاں درج کیا جا رہا ہے۔

(۴)

کلکتہ

۱۷۔۸۔۱۹۳۹ء

حبی فی اللہ۔ معلوم ہوتا ہے آپ کی ڈاک کا انتظام درست نہیں ہے اور خطوط تلف ہوتے ہیں۔ یہاں سے متواتر دو خط آپ کے نام جا چکے ہیں۔ پہلا خط سکریٹری نے لکھا تھا، خط کی رسید اور میری علالت کی بنا پر اعتذار کہ جواب کے لیے کسی قدر توقف کیجیے۔ دوسرا میں نے لکھا تھا، غالباً اسی دن جس دن آپ کا پہلا تار ملا۔ تعجب ہے آپ لکھتے ہیں اس وقت تک آپ کو جواب نہیں ملا۔ اب خط احتیاطاً رجسٹرڈ بھیجا جا رہا ہے،

اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبہ خدمت علم و دین کو اور زیادہ کرے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سر دست عربی کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ضروری حد تک اس کی تکمیل

---

(۱) یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۸ کے آخری الفاظ ہیں۔ ترجمہ یہ ہے: اور انجام کار انہیں کے لیے ہے جو متقی ہیں۔"

کرلیں۔ اگر یہ خانہ خالی رہ گیا تو نقشہ ناقص رہے گا۔ آپ تھوڑے عرصے کے اندر یہ منزل طے کر لے سکتے ہیں۔

میں نے آپ سے بعض امور دریافت بھی کیے تھے، پھر انھیں دہراتا ہوں۔ انگریزی میں آپ کی طبیعت کو ادب سے مناسبت ہوئی یا نہیں؟ انگریزی ادبیات کے ذوق و مطالعہ کا کیا حال ہے؟ انگریزی میں تحریر و کتابت کی طرف طبیعت متوجہ رہی یا نہیں؟ کیا آپ دو چار مصنفوں کے نام لکھیں گے جن کے انشاء و اسلوب کتابت سے طبیعت خاص طور سے متاثر ہوئی ہے۔ ان امور سے بہ تفصیل مطلع کیجیے۔

والسلام علیم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
ابوالکلام کان اللہ لہ

مولوی فضل محمد صاحب
معرفت مولوی فیض محمد صاحب
ڈسٹرکٹ جج
بہاول نگر (بہاول پور اسٹیٹ)

اب پانچواں خط ملاحظہ ہو جو ۱۶/جولائی ۱۹۴۵ء کا تحریر کردہ ہے جب کہ مولانا کو قلعہ احمد نگر سے رہا ہوئے چند روز گزرے تھے۔ یہ خط مشہور صحافی اور مولانا کے عقیدت مند ابوسعید بزمی مرحوم کے نام ہے۔

ابوسعید بزمی اپنے دور میں میدان صحافت کے معروف شہسوار تھے۔ وہ دراصل ہندوستان کے شہر بھوپال کے رہنے والے تھے۔ سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) کے ایڈیٹر رہے۔ کچھ عرصہ سہ روزہ "زمزم" (لاہور) کی ادارت کی۔ پھر مختلف اوقات میں لاہور کے روزنامہ "احسان" اور "شہباز" کی ادارتی ذمے داریاں ان کے سپرد رہیں۔

آزادی کے بعد بھی کچھ عرصہ صحافتی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ قیام لاہور کے زمانے میں ماڈل ٹاؤن رہتے تھے اور روزانہ بس یا تانگے سے سرکلر روڈ پر "احسان" کے دفتر آتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے کا ایک دن انھوں نے

لطیفہ سنایا کہ وہ دفتر آنے کے لیے گھر سے نکلے تو نہ کوئی بس ملی نہ تانگہ۔ پیدل چلتے چلتے اچھرے آگئے۔ وہاں سے بھی کوئی سواری نہ ملی تو سنٹرل جیل کی طرف رخ کرلیا، (جسے منہدم کر کے شادمان کالونی بنادیا گیا ہے) جیل روڈ عبور کر کے ریس کورس روڈ پر آگئے پھر لارنس روڈ کو گھومے اور ریس کورس روڈ اور لارنس روڈ کے چوک کے قریبی گیٹ سے لارنس گارڈن میں داخل ہوگئے۔ جم خانہ کلب (جہاں اب قائد اعظم لائبریری ہے) کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ مال روڈ پر آنا چاہتے تھے، اور وہاں سے اپنے دفتر جانا مقصود تھا۔ لارنس گارڈن میں مسلح گورکھے فوجی بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایک پہرے دار فوجی نے زور سے آواز دی۔

کون.....؟

بولے: بزمی......!

فوجی کی طرف سے جواب آیا: بھجنی۔ ٹھیک ہے، جاؤ۔

اس طرح بزمی کو بھجنی سمجھنے کی وجہ سے ان کی جان بچ گئی۔

وہ امریکی حکومت کی دعوت پر ایک صحافی کی حیثیت سے جون ۱۹۵۱ء میں امریکہ کے دورے پر گئے تھے کہ وسط ستمبر ۱۹۵۱ء میں حرکت قلب بند ہو جانے سے وہیں انتقال کر گئے اور ان کی میت لاہور لائی گئی اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ان کی اہلیہ پڑھی لکھی، حوصلہ مند خاتون تھیں۔ انھوں نے خواتین کے لیے لاہور سے "بنت راوی" ایک رسالہ جاری کیا تھا جو بڑا مقبول ہوا تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب مولانا آزاد رہا ہوئے، ابو سعید بزمی لاہور میں تھے، انھوں نے کسی سلسلے میں (جس کی تفصیل کا پتا نہیں چل سکا) مولانا کو خط لکھا، مولانا نے اسکے جواب میں مندرجہ ذیل مکتوب تحریر فرمایا۔

(۵)

۱۶ر جولائی ۱۹۴۵ء

عزیزی! خط پہنچا، میں تین برس کے بعد دنیا میں پھر واپس آیا۔ مجھے معلوم نہ تھا

کہ آپ اب لاہور میں ہیں۔ بہر حال آپ کا خط پڑھ کر وہ خوشی ہوئی جو مدتوں کے بعد ایک عزیز کو دیکھ کر ہوتی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ صورت حالات آپ کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں، معاملہ بالکل صاف اور روشن ہے۔ ذرا مجھے دم لینے کی مہلت ملے تو خط و کتابت کیجیے۔

گاندھی جی سے ملیے، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کی ملاقات اس بات کے لیے سودمند ہو سکتی ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ برسوں سے میں سیاسی مسائل میں ان سے اختلاف رکھتا ہوں اور میری راہ کانگریس میں ان سے الگ ہے۔ البتہ ہمارا اختلاف ہمارے ذاتی تعلق کو آلودہ نہیں کرتا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

اب مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے بارے میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کی کبھی باہم ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا بے شمار شعرا کے اشعار اپنی مختلف کتابوں میں درج کرتے ہیں لیکن اقبال کا کوئی شعر درج نہیں فرماتے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس قسم کے تمام اعتراضات رفع ہو جائیں گے اور صحیح صورت حال واضح ہو کر سامنے آجائے گی۔

لاہور میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بارایٹ لا) کی کوٹھی (بیرون یکی دروازہ) کو کسی زمانے میں برصغیر کے سیاسی رہنماؤں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ مختلف اوقات میں اس میں قائداعظم محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا انور شاہ کاشمیری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، حکیم محمد اجمل خاں، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو وغیرہ کئی دفعہ تشریف لائے۔ علامہ اقبال تو لاہور سے تعلق رکھتے تھے اور کہنا چاہیے کہ میاں صاحب کا گھر ان کا اپنا گھر تھا۔

اب یہ کوٹھی منہدم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ مالواڈہ کمپلیکس تعمیر کیا جا چکا ہے اور اس کے مکین اسد جان روڈ پر چھاونی منتقل ہو گئے ہیں۔ جب یہ حضرات اس کوٹھی میں مقیم تھے، میاں عبدالعزیز مرحوم کے صاحب زادے میاں عبدالمجید مرحوم بعض کمروں میں لے جاکر باقاعدہ ماہ وسال اور وقت کا تعین کر کے بتایا کرتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد آئے تو ان سے ملاقات کے لیے علامہ اقبال اور فلاں فلاں حضرات تشریف لائے۔ مولانا یہاں بیٹھے تھے، علامہ یہاں تشریف فرما تھے اور فلاں فلاں بزرگ اُس صوفے یا اس قالین پر اس انداز سے بیٹھے تھے اور فلاں مسئلے پر اس اسلوب میں بحث ہوئی تھی۔ وہ سب کے محل جلوس اور جائے قیام کی نشاندہی کیا کرتے تھے اور موضوع گفتگو کی تفصیلات بیان فرمایا کرتے تھے۔ یہ ایک تاریخی کوٹھی تھی اور اس میں بہت سے ہندو مسلم اکابر کی آمد ورفت رہتی تھی۔

مندرجہ ذیل سطور میں ہم یہ واضح کریں گے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے درمیان کن کن مواقع پر ملاقات ہوئی، کن امور کے متعلق خط و کتابت ہوئی اور کہاں کہاں مولانا نے علامہ کے اشعار درج کیے۔ مولانا اور علامہ کو باہم لڑانے اور دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے والے حضرات غور سے ان سطور کا مطالعہ فرمائیں۔

۱۔ علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے درمیان بقول میاں عبدالمجید کے نہایت خوش گوار طریقے سے مختلف مسائل پر سلسلہ کلام جاری رہتا تھا۔ میاں صاحب کا بیان ہے کہ ان حضرات کی گفتگو سب لوگ انتہائی غور اور توجہ سے سنتے اور اس سے استفادہ کرتے تھے۔

۲۔ ان دونوں حضرات کے مراسم و تعلقات کی نزاکت اور گہرائی کا اس حقیقت سے بھی پتا چلتا ہے کہ جہاں یہ علوم وفنون کے مختلف گوشوں میں مہارت رکھتے ہیں، وہاں ملکی سیاسیات کے نشیب و فراز سے بھی دونوں کو گہرا تعلق ہے اور پھر دونوں ذہنی اور عملی طور پر سیاسیات کے الگ الگ کیمپوں سے وابستہ ہیں۔ دونوں کا دور سیاسیات کا بھرپور دور ہے، لیکن نہ کبھی علامہ نے کسی سیاسی معاملے میں مولانا کے خلاف کوئی بیان دیا اور نہ کبھی مولانا نے علامہ کے کسی سیاسی نقطہ نظر کو محل تنقید ٹھہرایا۔ اس زمانے کا تمام سیاسی ریکارڈ دیکھ

لیجیے،ایک دوسرے کی مخالفت میں دونوں کی کوئی تحریر نہیں ملے گی۔یہ ان کے پر خلوص باہمی روابط کی بہت بڑی دلیل ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے انتہائی تکریم کا برتاؤ کرتے تھے نہ سیاسی میدان میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے تھے،نہ علمی میدان میں.......!

۳۔ماہنامہ "خدنگ نظر" منشی نوبت رائے نظر کا رسالہ تھا جو لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا چند مہینے اس کے حصہ مضامین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری "مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت" میں (ہماری زبان علی گڑھ،یکم نومبر ۱۹۶۹ء کے حوالے سے) لکھتے ہیں کہ "خدنگ نظر" کے مارچ ۱۹۰۳ء کے شمارے میں "عرض حال" کے عنوان سے اس کے مہتمم نے لکھا:

> "ہم نے اپنی کوششوں میں اپنے دلی دوست ابوالکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی کو بھی شریک کر لیا ہے،جن کے اکثر مضامین خدنگ نظر اور دوسرے معزز اردو جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں،آئندہ سے وہ خدنگ نظر کے حصہ مضامین کے لیے اسنٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض ادا کریں گے جو انھوں نے بخوشی قبول فرمائے ہیں۔"

اس وقت مولانا عمر کے پندرہویں سال میں تھے۔علامہ اقبال کے بارے میں پہلا تعارفی مضمون اسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ مولانا اس وقت اس کے عملہ ادارت میں شامل تھے اور اس قسم کے مضامین کی اشاعت کے ذمے دار وہی تھے۔

۴۔اپریل ۱۹۰۵ء میں جب مولانا انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں تشریف لائے،اس وقت وہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر تھے اور عمر ابھی سترہ سال کی نہیں ہوئی تھی۔ان کی تقریر سے لوگ نہایت متاثر ہوئے تھے۔علامہ اقبال سے اولین ملاقات اسی موقعے پر ہوئی تھی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے صفحہ ۳۲۳ پر رقم طراز ہیں:

"اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو "مخزن" نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا، لیکن بہت جلد ہی لوگوں میں غیر معمولی شہرت ہو گئی تھی۔ انجمن میں ان کی نظم خوانی خاص طور پر شوق و ذوق سے سنی جاتی تھی۔ ان سے بھی پہلی مرتبہ اس سفر میں ملاقات ہوئی"۔

۵۔ مولانا نے "الہلال" جاری کیا تو علامہ اقبال نے اس میں پوری دلچسپی لی اور اس کا حلقہ اشاعت بڑھانے کے لیے تگ و دو کی۔ چنانچہ ۹/ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے "الہلال" کے صفحہ اول پر مولانا نے مندرجہ ذیل نوٹ تحریر فرمایا۔

"الہلال کی توسیع اشاعت کے لیے ابتدا سے بغیر کسی تحریک اور طلب کے جو احباب سعی فرما رہے ہیں، دفتر ان کا شکر گزار ہے۔ ایسے حضرات تو بکثرت ہیں، جنھوں نے ایک ایک دو دو خریدار بہم پہنچائے، مگر جن احباب نے خاص طور پر اس بارے میں سعی کی ہے، ان کے اسمائے گرامی شکریے کیساتھ درج ذیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو مخلص اور بغیر منت و طلب، احسان کرنے والے احباب عطا فرمائے۔

اس فہرست میں چودہ حضرات کے نام درج ہیں، ان میں سے کسی نے سات، کسی نے آٹھ، کسی نے چار اور کسی نے چھ خریدار بہم پہنچائے، مگر مولانا فرماتے ہیں، دہلی کے ایک بزرگ نے جنھوں نے اپنا نام ہم پر بھی ظاہر نہیں کیا بارہ، جناب شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا (لاہور) نے دس اور جناب مولانا سید عبدالحق صاحب بغدادی نائب پروفیسر عربی محمڈن کالج علی گڑھ نے دس خریدار (بہم پہنچائے)

۶۔ "جواب شکوہ" اقبال کی مشہور نظم ہے۔ اس کی تائید میں (سابق) ریاست رام پور (یوپی) کے ہوم سکریٹری جناب صاحبزادہ مصطفیٰ خاں شرر کی نظم ۲۶/ فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" کے بہرہ ادبیات میں "جواب شکوہ کا اقبال" کے عنوان سے چھپی۔ یہ نظم "الہلال" کے دو صفحات (۱۲۔ ۱۳) پر مشتمل ہے۔

نہایت شاندار اور طویل نظم ہے۔

۷۔ قاضی افضل حق قرشی نے اپنی کتاب ''اقبال کے ممدوح علما'' میں شمشیر قلم، ۲۷ فروری ۱۹۱۴ء کے صفحہ ۲ سے مندرجہ ذیل اقتباس درج کیا ہے۔

۱۹ر فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ کے وفد کے ساتھ لاہور آئے اور اقبال سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ وفد مسلمانان ہند کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر وفد کا پرجوش استقبال کیا گیا۔ شام چار بجے باغ بیرون موچی دروازہ میں جلسہ عام منعقد ہوا۔ ارکان وفد اور مولانا آزاد جب جلسہ گاہ میں آئے تو حاضرین کی طرف سے ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے اور بے شمار پھول برسائے گئے۔ اس کے بعد حاجی شمس الدین سکریٹری انجمن حمایت اسلام لاہور نے نواب ذوالفقار علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ وسابق وزیر اعظم ریاست پٹیالہ کے صدر جلسہ بنائے جانے کی تجویز پیش کی جو اقبال کی تائید سے منظور ہوئی۔ نواب ذوالفقار علی خاں نے افتتاحی تقریر کی۔ ان کے بعد ڈاکٹر عدنان بے اور عمر کمال بے نے ترکی میں تقاریر کیں، جن کا ترجمہ علامہ توفیق بے ایڈیٹر رسالہ ''سبیل الرشاد'' قسطنطنیہ نے فارسی میں سنایا۔ ان کے بعد چودھری غلام حیدر خاں اسسٹنٹ ایڈیٹر ''زمیندار'' اور حاجی شمس الدین نے تقاریر کیں مولانا آزاد وفد کے ہمراہ اسی شام واپس چلے گئے کہ دوسرے دن دہلی میں بھی جلسہ ہو رہا تھا۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خاں نے مولانا آزاد پر زور دیا کہ مزید ایک روز لاہور میں قیام فرمائیں۔

۸۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کے ''الہلال'' میں ''الہلال پریس کی ضمانت طلبی'' کے عنوان سے سب ایڈیٹر کی طرف سے حسب ذیل اعلان شائع ہوا۔

بنگال گورنمنٹ نے ۱۶؍نومبر ۱۹۱۳ء کو "الہلال" پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی اور "الہلال" کے دو نمبر مورخہ ۱۴ و ۲۱؍اکتوبر ۱۹۱۴ء بھی جو مشترکہ صورت میں ایک ساتھ شائع ہوئے تھے، ضبطی میں آئے۔ بنگال گورنمنٹ نے جن مضامین کو قابل اعتراض قرار دیا وہ "حدیث الجنود" اور "سقوط انٹورپ" ہیں۔ ایک بلجیم تصویر بھی قابل اعتراض قرار دی گئی ہے، جسکے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج ہے۔

وما ظلمهم الله ولكن كانو ا انفسهم يظلمون

"الحمد اللہ مولانا آزاد کو آزادی ملی۔ ۔ ۔ ۔

"مولانا آزاد اب کہاں ہیں؟ پتا لکھیے، ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں"۔

مولانا یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تھے۔ علامہ کا یہ مکتوب گرامی انہی دنوں کا ہے۔

۱۲۔ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مولانا سے انتہائی عقیدت مندانہ تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے "مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک شخصی مطالعہ" کے نام سے کتاب لکھی ہے، جو بہت سے معلومات پر محتوی ہے۔ اس کتاب کا صفحہ ۱۸ دیکھیے "میاں عبدالعزیز کی کوٹھی پر ملاقات" کے عنوان کے تحت وہ رقم فرماتے ہیں:

> مولانا جب کبھی لاہور تشریف لاتے تو عموماً میاں عبدالعزیز بیرسٹر کی کوٹھی میں ٹھہرا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ان کی آمد کا علم ہوا تو میں اپنے ایک ہم سبق دوست ڈاکٹر محمد شاہ مرحوم ساکن ڈیرہ اسماعیل خاں کے ساتھ کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اس دن انھوں نے چند اکابر لاہور کو خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ فرشی نشست تھی۔ بہت سے اکابر موجود تھے۔ علامہ اقبال مرحوم مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی اس محفل میں گھس کر بیٹھ گئے۔ مولانا کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک سلپ تھی، جس پر تقریر کے پوائنٹ لکھے ہوئے تھے۔ موضوع تو اب یاد نہیں رہا، البتہ یہ بات ذہن پر نقش ہے کہ تقریر کرنے کے بعد مولانا آزاد علامہ اقبال کی

طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

علامہ صاحب! "کیا یہ ٹھیک ہے؟"

علامہ مرحوم نے زوردار الفاظ میں تائید کرتے ہوئے فرمایا: "بالکل ٹھیک ہے"۔

معلوم ہوتا ہے یہ ۱۹۲۱ء کے پس و پیش کا واقعہ ہے۔

۱۳۔ مولانا غلام رسول مہر نے مولانا آزاد اور علامہ اقبال کی ایک ملاقات کا ذکر اپنے مکتوب گرامی (بنام فیض لدھیانوی مورخہ ۲۷ / مئی ۱۹۷۱ء) میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ جناب افضل حق قرشی کی تصنیف "اقبال کے ممدوح علما" کے حوالے سے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

> "ایک ملاقات میرے سامنے نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی دعوت طعام پر ہوئی تھی۔ حضرت علامہ نے بطور خاص فرمایا تھا کہ ہمیں مولانا آزاد کے ساتھ بٹھایا جائے تاکہ ان سے باتیں کر سکیں۔ میں نے اس کا انتظام کیا اور کھانے کے دوران میں دونوں بزرگ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔"

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ملاقات کب اور کس سن میں ہوئی۔ ممکن ہے یہ بھی ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہو۔

۱۴۔ بعض اہم مسائل کی گرہ کشائی کے لیے علامہ اقبال خود تو مولانا کے باب تحقیق پر دستک دیتے ہی تھے، دیگر تشنگان علوم کو بھی ان سے رجوع کرنے کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ افضل حق قرشی (خطوط اقبال صفحہ ۱۶۳۔۱۶۷ شائع کردہ مکتبہ خیابان ادب کے حوالے سے) "اقبال کے ممدوح علماء" میں لکھتے ہیں کہ سید محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں علامہ نے ان کو "اسلام کا مطالعہ زمانہ حال کی روشنی میں" کے متعلق لکھا:

> "میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی

میں ہیں، مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حکما میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علیٰ ہذاالقیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمہ، مفسرین میں معتزلی نقطہ خیال سے زمخشری اشعری نقطہ خیال سے رازی اور زبان و محاورے کے اعتبار سے بیضاوی... میری رائے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام اس بارے میں بہتر مشورہ دے سکیں گے۔"

۱۵۔ یکم اپریل ۱۹۲۳ء کو مولانا نے کلکتے سے عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں عربی کا پندرہ روزہ "الجامعہ" جاری کیا تھا۔ اس کا آخری شمارہ ۱۹۲۴ء کے مئی جون کا مشترکہ شمارہ شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار ایک سال سے زائد عرصہ جاری رہا۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مولانا آزاد نے اس نام کا ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری فرمایا تھا، لیکن یہ رسالہ کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ بہت عرصے کے بعد پرانی انارکلی میں ایک پرانے واقف حافظ ابو بکر صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ یہ مولانا عبدالعزیز آفندی کے بیٹے ہیں جو مولانا آزاد کے بے حد معتقد تھے اور جنھوں نے لاہور کے محلہ فاروق گنج میں الہلال بک ایجنسی کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کی طرف سے مولانا کی کئی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔ امام ابن تیمیہ کی چند کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہوئے تھے جو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے کرائے گئے تھے۔

مولانا عبدالعزیز آفندی کو میں نے دیکھا ہے، وہ بڑے خوب صورت اور خوش مزاج شخص تھے۔ میں تقسیم ملک کے کچھ مدت بعد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ اسوقت وہ فالج کے مرض میں مبتلا تھے، لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور مولانا آزاد سے اپنے دیرینہ تعلقات کے بارے میں چند باتیں بیان کیں۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حافظ ابو بکر صاحب مجھے ٹولنٹن مارکیٹ میں شمیم بیکرز میں لے گئے، وہاں انھوں نے لکڑی کا ایک صندوق رکھا تھا، جس میں ان کے والد کے کچھ

کاغذات اور الہلال اور البلاغ کے چند فائل تھے۔ "الجامعہ" کے چند شمارے بھی مجلد صورت میں موجود تھے۔

میں نے الجامعہ کی ورق گردانی کی تو اس کے ایک شمارے میں علامہ اقبال کے مشہور اور مقبول "ترانہ ملی" کا عربی نظم میں ترجمہ کیا گیا تھا..... شروع میں ایک طویل نوٹ تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ "ترانہ ملی کا شمار عمدہ ترین نغموں میں ہوتا ہے اور یہ قارہ ہند کے ممتاز شاعر اور نامور فلسفی علامہ اقبال کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال یورپ کی شہیر یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ و سند یافتہ ہیں۔ ہندوستان کی اس بلند پایہ شخصیت کو جدید علوم پر عبور حاصل ہے اور اپنے اقران و معاصرین میں ان کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی شاعری خدمت اسلام اور احیائے دین کا بہترین ذریعہ ہے۔ باشندگان وطن انتہائی شوق سے ان کا کلام پڑھتے اور اس سے بیحد متاثر ہوتے ہیں۔ انگلستان میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا حصہ انگریزی میں منتقل ہو چکا ہے، جو وہاں کے اصحاب علم کے مطالعے میں آرہا ہے، اور وہ لوگ ان کے افکار کو بڑی اہمیت دیتے ہیں"۔

یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے۔ بیٹھے بیٹھے دو مرتبہ میں نے عربی کا یہ نوٹ پڑھا اور بحمد اللہ اس کا ترجمہ، ذہن کی گرفت میں آگیا جو گھر آکر ایک کاپی میں لکھ لیا گیا۔

اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائرکٹر سراج منیر مرحوم تھے۔ میں نے ان کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ اس پر مضمون لکھیے اور وضاحت کیجیے کہ مولانا آزاد کے دل میں علامہ اقبال کی کیا قدر و منزلت تھی، لیکن افسوس ہے میں اس وقت مضمون نہ لکھ سکا۔

اس سے چار سال بعد ۱۹۸۹ء میں ہمارے محترم دوست ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت" شائع ہوئی۔ وہ اپنی ہر تصنیف از راہ کرم اس فقیر کو ارسال کرتے ہیں۔ یہ کتاب بھی ارسال فرمائی۔ اس کے صفحہ ۱۸۳ پر "الجامعہ" کا ذکر ہے اور "ترانہ ملی" کے عربی ترجمے اور اقبال سے متعلق تعارفی نوٹ کا تذکرہ

بھی ہے۔ الفاظ کے کچھ فرق سے بالکل یہی ترجمہ ہے جو گزشتہ سطور میں درج کیا گیا ہے۔
عربی نوٹ پڑھتے وقت میں نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ ترجمہ کس نے کیا ہے۔ اس کا علم ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب سے ہوا۔ وہ اس کے صفحہ ۱۸۴ پر لکھتے ہیں:

"الجامعہ نے آئندہ شماروں میں علامہ مرحوم کے فارسی کلام کی اشاعت کا بھی وعدہ کیا تھا۔ "ترانہ ملی" کا منظوم عربی ترجمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے استاد مولانا عبدالحق حقی اعظمی بغدادی نے کیا تھا۔ مولانا عبدالحق عربی کے ادیب اور شاعر تھے۔ "الجامعہ" نے ان کی متعدد منظومات شائع کی ہیں۔"

اندازہ کیجیے اقبال کے بارے میں مولانا آزاد کے کیا خیالات ہیں اور وہ انھیں کتنا بڑا فلسفی اور شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کی کسی نظم کو پہلی مرتبہ مولانا آزاد ہی کے اخبار میں عربی میں منتقل کیا گیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کا مولانا نے اقبال کو مستحق گردانا۔ کیا اقبال کے کسی دکان دار نے کبھی اتنا بڑا کام کیا؟

لاہور میں مولانا کے اس عربی رسالے "الجامعہ" کی مکمل فائل ہمارے قابل احترام دوست جناب محمد عالم مختار حق کے کتب خانے میں موجود ہے۔ محمد عالم صاحب کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہ بڑے باخبر اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ "الجامعہ کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۲۳ء میں کلکتے سے شائع ہوا تھا۔ آخری شمارہ ۱۹۲۴ء کے مئی جون کا مشترکہ شمارہ ہے۔ رسالہ چودہ مہینے جاری رہا۔

۱۶۔ عربی کا پندرہ روزہ "الجامعہ" بند ہوا تو اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا نے کلکتہ سے روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر بھی عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ صحیح تاریخ کا تعین کرنا تو مشکل ہے، لیکن اندازہ یہ ہے کہ "پیام" ۱۹۲۵ء کے پس و پیش جاری کیا گیا تھا۔

عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی کتاب "ذکر آزاد" کے صفحہ ۳۱۲ پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال، ملک الشعرا" اس عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

"اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ مصری شاعر احمد شوقی پاشا کو عرب ملکوں نے "امیر الشعرا" کا خطاب دیا تھا۔ اس پر مولانا آزاد (آزاد) کو خیال ہوا کہ ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کو "ملک الشعرا" بنادیا جائے۔ ایک دن صبح مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے مخالفت کی۔ متعجب ہو کر فرمایا:

کیاڈاکٹر اقبال اس خطاب کے اہل نہیں ہیں؟

عرض کیا: ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ کمالات کے مبصر آپ ہیں۔ مجھے شاعری سے ذوق نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب محض شاعر ہی نہیں ہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں اور ہم ان کی سیاست کے مخالف ہیں۔ ملک الشعرا بن کر وہ سیاسی فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں۔

مولانا سوچ میں پڑگئے اور میں کہتا رہا، "اخبار کے مالک آپ ہیں اور جو تجویز چاہیں پیش کر سکتے ہیں، لیکن جب تک ایڈیٹر میں ہوں، اپنے، ضمیر کے خلاف کسی تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میرا نام ایڈیٹری سے الگ کر دیا جائے، اس کے بعد بھی اخبار کی خدمت جاری رکھوں گا"۔

وہ آگے لکھتے ہیں:

"مولانا بااصول اخبار نویس تھے اور اپنے اخبار کے ایڈیٹر کی رائے کا احترام کرتے تھے۔"

فرمایئے ملک الشعرا کا خطاب اقبال کو کس نے دینا چاہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یا اقبال کے موجودہ مداحوں میں سے کسی مداح نے؟ جنھوں نے اقبال کو آمدنی کا ذریعہ بنار کھا ہے۔ اس کے بعد کیا فرماتے ہیں، وہ حضرات جن کا ارشاد ہے کہ مولانا آزاد نے کہیں اقبال

کا نام نہیں لیا؟ اگر اقبال کا نام لینے سے مراد اقبال کے نام کی کوئی دکان سجانا ہے یا اقبال کے شاہین یا اقبال اور عورت وغیرہ قسم کی کوئی کتاب تصنیف کرنا یا مضمون لکھنا ہے یا منبر پر کھڑے ہو کر اقبال کے اشعار پڑھنا ہے تو مولانا نے واقعی یہ کام نہیں کیا۔

۷۱۔ سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کے بہت سے خطوط دست یاب بھی ہو گئے ہیں اور چھپ بھی گئے ہیں، مگر جو خطوط انھوں نے مولانا کو لکھے، افسوس ہے وہ شائع نہیں ہوئے اور شاید دست یاب بھی نہ ہوئے ہوں، تاہم سید صاحب اور بعض دیگر حضرات کے نام علامہ اقبال کے مرسلہ خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سے علمی معاملات میں مولانا کی خدمت میں خطوط ارسال کیے تھے، یقیناً مولانا نے بھی جواب میں خط لکھے ہوں گے، مگر وہ ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئے کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں سے کچھ خطوط دست یاب تو کہیں سے ہو گئے ہوں، مگر کچھ حضرات ان خطوط کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوں؟ اقبال کے بارے میں جس قسم کے افکار بعض لوگ مولانا کی طرف منسوب فرماتے ہیں، ان کے پیش نظر کسی کے دل میں اس شبہے کا کروٹ لینا بعید از قیاس نہیں۔

شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ اقبال نامہ کے حصہ اول کے ایک خط میں جو علامہ نے سید سلیمان ندوی کی خدمت میں ۱۸ر اگست ۱۹۲۴ء کو لکھا، تحریر فرماتے ہیں:

> ”امریکہ کی مشہور یونیورسٹی (کولمبیا) نے ایک کتاب شائع کی ہے، جس کا نام ”مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات“ ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے، یعنی یہ کہ مثلاً مدت شیر خوارگی جو نص کی رو سے دو سال ہے، کم یا زیادہ ہو سکتی ہے، یا حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفا اور معتزلہ کے نزدیک اجماع یہ اختیار رکھتا ہے، مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟

امر دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے مولانا ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے"۔

علامہ کے اس سوال اور مولانا کے جواب کو علمی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے مگر افسوس ہے دونوں حضرات کے مکتوبات دست یاب نہیں ہیں۔

۱۸۔ مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے ملاپ اور دونوں کے ایک ہی مقام پر تشریف فرما ہونے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو، جو مالک رام کی کتاب "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" کے صفحہ ۹ سے یہاں درج کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"غالباً ۱۹۲۷ء کے اواخر کی بات ہے، سائمن کمیشن کی تشکیل اور اس کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا۔ بیشتر سیاسی حلقے اس پر سخت ناراض بلکہ برافروختہ تھے کہ کمیشن میں کوئی ہندوستانی نہیں لیا گیا تھا، اس لیے اکثر جماعتوں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ لاہور کے سر محمد شفیع اور ان کے ہم نوا بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ لاہور میں جلسہ ہوا، جس کا مقصد حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج کرنا اور لوگوں کو کمیشن کے بائیکاٹ کی ترغیب دلانا تھا۔

جلسہ غالباً موچی دروازے (یا شاید بھاٹی دروازے) کے باہر کمیٹی باغ میں ہوا تھا۔ اسٹیج پر من جملہ اور اصحاب کے مولانا آزاد اور علامہ اقبال اور مولانا محمد علی تشریف فرما تھے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ ہم نے اسلام کی تعلیم ان دونوں بزرگوں ...اقبال اور آزاد..... سے پائی۔ آج ایک ہمیں کمیشن سے تعاون کی تلقین کر رہے ہیں اور دوسرے اس کے بائیکاٹ کی۔ ہم عجب گومگو میں ہیں کہ کس کا تتبع کریں۔ (اس میں اشارہ اقبال کی فارسی مثنویات اسرار و رموز اور مولانا آزاد کے ہفت روزہ الہلال کی طرف تھا)

یہاں یہ یاد رہے کہ اقبال کا تعلق میاں سر محمد شفیع سے تھا اور ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ نہ کیا جائے، جب کہ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی وغیرہ بائیکاٹ کی مہم چلا رہے تھے۔

۱۹۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک سے زائد مرتبہ بتایا کہ مولانا لاہور تشریف لاتے تو زیادہ تر میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا کی کوٹھی (بیرون یکی دروازہ) میں قیام فرماتے تھے۔ بے شمار لوگ ان سے ملاقات کے لیے وہاں آتے تھے۔ علامہ اقبال خاص طور سے آتے اور مختلف مسائل پر مولانا سے گفتگو فرماتے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ آئے، جن میں ان کے بے تکلف دوست چودھری شہاب الدین بھی تھے۔ علامہ نے مولانا سے کوئی بات پوچھی، مولانا نے تفصیل سے جواب دیا۔ اب علامہ مطمئن ہو گئے تھے۔ مزید سوال کی یا بحث کی ضرورت نہ تھی، لیکن چودھری شہاب الدین چونکہ علامہ سے نہایت بے تکلفانہ مراسم رکھتے تھے اور بالعموم ان سے پنجابی میں بات کیا کرتے تھے، اس لیے انھوں نے علامہ سے پنجابی میں کہا:

اوئے ساڈے نال او کھا ہوندا نیں، ہن کر گل

مولانا آزاد تو ان کی بات سمجھ نہیں پائے لہٰذا خاموش رہے، لیکن دوسرے حاضرین مجلس چودھری صاحب کے انداز کلام سے بہت محظوظ ہوئے۔

یہ ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔

۲۰۔ اقبال نامہ حصہ اول میں سید صاحب کے نام علامہ کا ایک خط ۱۷/اگست ۱۹۳۶ء کا لکھا ہوا، مندرج ہے، جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

> الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال علما کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

۲۱۔ علامہ اقبال کی وفات کا حادثہ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو پیش آیا تھا۔ اس سے چار دن

بعد ۲۵ / اپریل ۱۹۳۸ء کو مولانا آزاد نے مولانا محی الدین احمد قصوری کے نام کلکتے سے خط لکھا جو "تبرکات آزاد" کے صفحہ ۴۷ پر درج ہے۔ خط کا نمبر ۱۶ ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں۔

ان الفاظ کے حاشیے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"مولانا نے اس قلق انگیز واقعے پر ایک بیان بھی دیا تھا۔ یہ چند الفاظ ہیں، لیکن دیکھیے ان میں درد دل کس طرح کھنچ آیا ہے۔"

مولانا تیار کو "طیار" لکھا کرتے تھے، ہم نے یہاں وہی لفظ رہنے دیا ہے جو انھوں نے استعمال فرمایا تھا۔ اور یہی درست ہے۔

۲۲۔ اقبال کی وفات پر مولانا آزاد کا ایک تعزیتی بیان افضل حق قرشی نے عبداللہ انور بیگ کی کتاب دی پوئٹ آف دی ایسٹ (انگریزی) کے صفحہ ۵۶ سے "اقبال کے ممدوح علما" میں نقل کیا ہے:

یہ تصور کس قدر الم ناک ہے کہ اقبال ہم میں نہیں۔ جدید ہندوستان اردو کا اس سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کی فارسی شاعری کا بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ یہ تنہا ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔ ذاتی طور پر میں ایک پرانے دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔

۲۳۔ "غبار خاطر" کے مکتوب نمبر ۲۰ میں جو ۱۸ / مارچ ۱۹۴۳ء کا تحریر فرمودہ ہے، مولانا نے اقبال کا ایک شعر درج کیا ہے جو یہ ہے۔

تا تو بیدار شوی، نالہ کشیدم ، ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

[یہ شعر زبور عجم (طبع دوم، اپریل ۱۹۴۴ء) کے صفحہ ۱۰۱ پر مرقوم ہے]

مالک رام نے اپنی مرتبہ "غبار خاطر" میں لکھا ہے کہ سید مقبول حسین وصل

گرامی نے ماہانہ رسالہ "مرقع" جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے اقبال سے درخواست کی کہ "مرقع" کے سرورق پر چھاپنے کے لیے کوئی شعر عنایت فرمایے۔ اس پر اقبال نے یہی شعر لکھ بھیجا۔ تین برس تک یہ "مرقع" کے سرلوح پر چھپتا رہا۔

غبار خاطر مولانا کی نہایت مقبول و مشہور کتاب ہے۔ مالک رام صاحب نے بڑی محنت سے اس کے عربی، فارسی، اور اردو اشعار کی تخریج کی ہے اور حل طلب مقامات پر حواشی لکھے ہیں۔

یہ کتاب مختلف اوقات میں بہت سے ناشروں نے شائع کی ہیں مگر مکتبہ رشیدیہ لاہور کا ایڈیشن کاغذ، کتابت، جلد وغیرہ میں سب سے بازی لے گیا۔ اس میں ایک قابل تحسین کام یہ کیا گیا ہے کہ فارسی اور عربی کے اشعار کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ اب فارسی اور عربی سے ناواقف حضرات اس سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں۔

کتاب میں کم و بیش سات سو شعر ہیں، جن کی تخریج کی گئی ہے۔ دو سو اردو کے اور پانچ سو عربی و فارسی کے..... ان کی تخریج کا نہایت اہم کام مالک رام نے کیا اور ان کا ترجمہ مکتبہ رشیدیہ کے مالک و مدیر حافظ عبدالرشید ارشد کی محنت و کوشش سے ہوا۔

یہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے باہمی مراسم و علائق کی ایک جھلک .... کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو تو علامہ خود بھی مولانا سے دریافت کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ان کے علم و فضل سے مستفید ہونے کا مشورہ دیتے ہیں..... ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی تصانیف ان کو بھجواتے ہیں۔ ان کے اخبار (الہلال) کے لیے خریدار مہیا کرتے ہیں مولانا بھی ان کے فکر و فن، شاعرانہ کمالات اور فلسفہ و حکمت کے قدردان ہیں اور برملا اس کا اظہار فرماتے ہیں، بلکہ انھیں ملک الشعرا کا خطاب دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ ان کے اردو کلام کو عربی کا جامہ پہناتے ہیں۔ اپنے اخبار (البلاغ) کے صفحہ اول پر ان کا کلام شائع کرتے ہیں، جب کہ ان کے علاوہ اس سے قبل یا بعد کسی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام الہلال یا البلاغ کے پہلے صفحے پر چھپنے کا اعزاز حاصل نہیں کر پایا۔

اپنی معروف کتاب غبار خاطر میں ان کا شعر درج کرتے ہیں حالاں کہ اس کتاب میں ان کے کسی معاصر شاعر کا کوئی شعر درج نہیں ہوا۔

ان کی وفات پر بیان دیتے ہیں، جس میں گہرے حزن وملال کا اظہار کیا جاتا ہے۔

معلوم نہیں بعض لوگ کیوں ان کو باہم لڑانے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے پر زور دیتے ہیں، جب کہ یہ دونوں دوست ہیں...! اور ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔

۹/اکتوبر ۱۹۹۰ء کے ہفت روزہ "ندا" (لاہور) میں ڈاکٹر محمد باقر (مرحوم) کا مولانا آزاد کے متعلق ایک دلچسپ اور معلومات افزا مضمون شائع ہوا تھا جو ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا کے بارے میں بعض ایسی چیزیں معرض بیان میں آئی ہیں، جن کا اکثر لوگوں کو علم نہیں..... اس مضمون سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے ابتدائی عمر میں دہلی جا کر حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا تھا۔

مولانا آزاد اگست ۱۸۸۸ء (ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ) کو پیدا ہوئے اور حضرت میاں صاحب نے ۱۳/اکتوبر ۱۹۰۲ء (۱۰/رجب ۱۳۲۰ھ) کو وفات پائی۔ اس طرح میاں صاحب کی وفات کے وقت مولانا عمر کے پندرھویں سال میں داخل ہو گئے تھے اور مروجہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے۔

مولانا نے حضرت میاں صاحب سے تعلق شاگردی کی بنا پر عارضی حکومت کے زمانہ وزارت میں میاں صاحب کی مسجد اور کتب خانے کے لیے کچھ رقم بھی منظور کی تھی جس کا اس مضمون سے پتا چلتا ہے۔

اس مضمون کے بعض حصے یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں۔

> ہندوستان میں میری نسل کے ہر آدمی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سن رکھا تھا۔ میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا، جب "الہلال" شائع ہونا شروع ہوا۔ قیمت زیادہ تھی کہ اس زمانے میں چھ آٹھ آنے بڑی اہمیت

کے حامل تھے، مگر یہ فقیر کسی نہ کسی طرح اسے باقاعدگی سے خرید تا ہی رہا۔ اسی زمانے میں قرآن مجید کی تفسیر ترجمان القرآن کی اشاعت کے بارے میں اشتہار شائع ہوا۔ میری گلی میں رہنے والے ایک بزرگ دوست ڈاکٹر عبدالرشید نے مولانا کو اس تفسیر کا اشتہار دیکھ کر چند روپے بھجوائے تھے لیکن مولانا اس اثنا میں گرفتار ہو کر جیل چلے گئے اور تفسیر لی اشاعت رک گئی۔ ڈاکٹر عبدالرشید نے (جو انگلستان کے فارغ التحصیل طبی معالج تھے اور محلہ شیخاں گجرات کے رہنے والے تھے) پیشگی ترسیل زر کی رسید کئی سال سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے طلب فرمایا اور میں نے رسید کا حوالہ دے کر مولانا سے تفسیر قرآن بھجوانے کی درخواست کی۔ مولانا نے جواب میں تفسیر کی جلد بھجوادی اور ساتھ ہی ایک خط لکھا جس میں فرمایا کہ خدا کا شکر ہے مجھے اس قرضے سے نجات ملی۔

اس سے بیس اکیس سال بعد جب ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل ہوئی تو میں صوبہ دہلی کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن منتخب ہو کر وہاں پہنچا۔ انتخاب انڈین پبلک سروس کمیشن نے کیا۔ جس کے صدر عتیق الرحمٰن کے والد کرنل عبدالرحمٰن تھے جو طب کے ڈاکٹر تھے۔ قومی حکومت میں میرے پہلے وزیر ہندو تھے، دوسرے ابوالکلام آزاد ہوئے اور سکریٹری سر جان سارجنٹ... مولانا فائلوں پر بعض احکام اردو میں لکھ دیتے۔ چونکہ سر جان کو معلوم تھا کہ میں فارسی کا طالب علم ہوں، اس لیے وہ فوراً مجھے ٹیلی فون کرتے "مولانا نے کچھ فارسی میں لکھا ہے، آکر پڑھ دو۔" میں سکریٹریٹ پہنچ کر تعمیل کر دیتا۔ مولانا سے براہ راست بھی دفتری کام کی وجہ سے واسطہ پڑتا تھا۔

سب سے پہلے رابطہ اس وقت قائم ہوا جب دہلی کے تمام مدارس نے یہ کہ کر ہڑتال کر دی کہ ہماری گرانٹ اخراجات کے اعتبار سے سو فی صد کر دی جائے ورنہ ہم اسکول نہیں چلائیں گے۔ صورت حال عجیب تھی۔ دہلی میں کوئی سرکاری اسکول نہیں تھا،

مختلف گروہ مثلاً گجراتی، بنگالی وغیرہ نہایت عمدہ عمارات میں نہایت شان دار اسکول چلا رہے تھے۔ مسلمانوں نے بھی چار پانچ اسکول بوسیدہ عمارتوں میں کھول رکھے تھے جن کے منیجر لیاقت علی خاں تھے۔ اسکولوں کو گرانٹ حکومت ہند کی طرف سے میں ہی منظور اور ادا کرتا تھا۔ ہندو گرانٹ لینے کے ماہرانہ طریقے استعمال کرتے اور مسلمان بالکل پھسڈی تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بیشتر روپیہ ہندوؤں کے پاس چلا جاتا۔ بہر صورت اس قضیے کے وقت تمیں فیصد اخراجات کی گرانٹ میں دے رہا تھا۔ جب اسکولوں میں ہڑتال ہو گئی تو مولانا نے مجھے طلب فرمایا۔ مسئلہ ان کے ہندو پیشرو راج گوپال آچاریہ کے وقت سے چل رہا تھا جس نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا "میں قومی حکومت ہند کا دیوالہ نکالنے نہیں آیا، میں اس سے زیادہ گرانٹ نہیں دوں گا۔"

مولانا نے یہ بات سنی تو پوچھا کہ پبلک میں اس تحریک کی پشت پناہی کون کر رہا ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ ایک لاہوری ہندو کانگریسی ہے (نام یاد نہیں رہا)۔ مولانا نے اسے فوراً بلوایا اور یہ طے ہوا کہ اسکول کھول دیے جائیں۔ گرانٹ سو فی صد کر دی جائے گی یا حکومت اسکول سنبھال لے گی۔ کیونکہ وائسرائے اور دوسرے وزرا، اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں چنانچہ دوسرے دن اسکول کھل گئے۔

ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں:

مولانا اس فقیر کو کبھی دفتر اور کبھی گھر پر یاد فرماتے۔ پہلی دفعہ میں مکان پر پہنچا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ حکومت ہند کے وزیر کا ڈرائنگ روم اندازاً سو فٹ لمبا ہے جس کے ایک سرے پر صوفے پر مولانا بیٹھے تھے اور ملاقاتی ان کے قریب.... رخصت ہونے لگا تو میں نے دیکھا کہ مولانا کے صوفے پر سامنے لٹکے ہوئے کور کے نصف حصے پر بطخوں کی گردنیں الٹی چھپی ہوئی تھیں۔ نیشنل حکومت نے آتے ہی سارا فرنگی فرنیچر اور فرش فروش بدل کر سودیسی سامان رکھ دیا تھا اور کھدر کے خوب صورت کور نہایت نفیس چھپائی کے ساتھ صوفوں پر بھی چڑھا دیے گئے تھے۔

میں نے عرض کیا کہ میں دفتر کا درزی بھجوادیتا ہوں جو یہ درست کردے گا۔

(میرے پاس بھی امتحانی پرچے بند کرنے کے لیے درزی تھا) مولانا نے ایک نظر صوفے پر ڈالی اور فرمایا۔ ''نہیں بھائی! میں یہ خود کروالوں گا، لیکن ایک بات کہے دیتا ہوں کہ تم نے کیا نظر پائی ہے۔ ''محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں ذکر کیا ہے کہ دلی میں اپنی پالکی میں گزرتے ہوئے کوئی شاعر اگر راستے میں کوئی چارپائی پڑی ہوئی دیکھتے جس میں کان پڑی ہوتی تو پالکی رکوا کر اس وقت تک وہاں رکے رہتے، جب تک وہ کان درست نہ ہو جاتی..... اس کی طرف اشارہ تھا۔

ایک دفعہ مولانا نے یاد فرمایا اور ایک ہندو خاتون سے تعارف کرایا۔ پھر کہا ''آپ کے ہاں انسپکٹرس آف اسکولز کی ایک اسامی خالی ہے، پبلک سروس کمیشن نے اشتہار دیا ہے، انھوں نے بھی عرضی دی ہے۔ بھائی! یہ چند سال پہلے بھی اس عہدے پر مامور تھیں، سروس کمیشن میں آپ محکمے کی نمائندگی کرتے ہیں، ان کے خاوند جیل میں ایک دفعہ میرے سیل (Cell) میں بھی رہ چکے ہیں، بڑے کام کے آدمی تھے اب سورگباش ہو چکے ہیں۔'' میں مدد کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

دفتر میں آکر خاتون کی فائل نکلوائی تو معلوم ہوا کہ اس پر میرے پیشرو مسٹر چیٹر جی (لاہور والے چیٹر جی، پرنسپل گورنمنٹ کالج کے بڑے بھائی) نے خاتون کے خلاف شدید الزامات لگا کر ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ ویسے تعلیمی اعتبار سے وہ اس عہدے کے لیے ہر طرح موزوں تھیں۔ میرے ہندو پی۔ اے نے اطلاع بہم پہنچائی کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب الزامات غلط تھے، لیکن خاتون کے خاوند کٹر کانگریسی اور جوشیلے آدمی تھے۔ سال میں ایک دو مہینے جیل سے باہر رہتے اور پھر جیل چلے جاتے۔ وائسرائے کے کہنے پر تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ ان صاحب کی بیوی محکمہ تعلیم میں افسر ہے اور معقول مشاہرہ لے رہی ہے۔ گھر بار اسی یافت سے چلتا ہے۔ بال بچے بھی ہیں، لیکن انھوں نے کوئی غم پال نہیں رکھا۔ انگریز کے خلاف تقریریں کر کے قید ہو جاتے ہیں۔ رہا ہوتے ہیں تو سرکاری کوٹھی میں اہلیہ کے

ساتھ رہتے ہیں اور پھر یہی عمل دہرا کر جیل میں پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ وائسرائے نے اپنے وسائل سے ڈائرکٹر تعلیم صوبہ دہلی سے کہلوایا کہ خاتون کو ملازمت سے فارغ کر دیا جائے۔ چیٹر جی صاحب نے اسی وقت یہ فائل تیار کی اور وائسرائے کا حکم بجالائے۔

میں نے انٹرویو کے وقت ساری کہانی سروس کمیشن میں دہرادی اور نیشنل گورنمنٹ میں خاتون کو دوبارہ ملازمت مل گئی۔ انھوں نے کام سنبھالنے والے دن مجھے عرضی دی کہ انھیں ان تین سال کی تنخواہ اور تنخواہ میں اضافے بھی دیے جائیں جو وہ ملازمت سے باہر رہی ہیں۔ میں نے دفتر سے پوچھا اور پھر A-G-C-R (اکاؤنٹنٹ جنرل سنٹرل ریونیو) سے مشورہ کیا۔ وہ ملازمت کا گھسا پٹا مدراسی بڑا تجربہ کار انسان اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کا آدمی تھا کہنے لگا: "اگر وائسرائے بھی کہے تو میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ صحیح ہے کہ اس خاتون کو کسی قصور کے بغیر سزا دی گئی۔ لیکن جو ملازمت اس نے کی نہیں اور اس کے فرائض بجالا کر کوئی اور آدمی اس اسامی کی تنخواہ وصول کرتا رہا ہے، اس کی تنخواہ دوسری دفعہ میں اسے کیسے ادا کر سکتا ہوں۔"

اگلے دن میں نے سارا قصہ مولانا کو سنایا تو فرمایا: "بھائی! آپ کا شکریہ، لیکن قانون کی خلاف ورزی کیسے کی جا سکتی ہے؟"

اس زمانے میں ایسٹ بنگال، صوبہ سرحد، بلوچستان، سنٹرل انڈیا، شملہ، اجمیر اور مارواڑ کے تعلیمی مسائل بھی حکومت ہند سے وابستہ اور مجھ سے متعلق تھے۔ انجمن ترقی اردو سے مولوی عبدالحق کے ایک معاون مولوی عبدالرشید تبسم گرانٹ کے لیے تشریف لائے۔ یہ کام بھی میرے سپرد تھا۔ چند دنوں کے بعد مولوی صاحب بھی آئے اور انھوں نے میرے دفتر میں بیٹھ کر لیاقت علی خان وزیر خزانہ کو عادتاً بے نقط سنائیں۔ میں نے مولانا سے ذکر کیا۔ فرمایا: "بھائی! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، اگر تم انجمن ترقی اردو کو گرانٹ دے دو..... لیکن یہ سوچ لو کہ اس کے ساتھ ہی سارے ہندوستان سے ہندوؤں کے اسی نوع کے سیکڑوں اداروں سے گرانٹ کا تقاضا ہو گا، پھر کیا کرو گے

؟" چنانچہ انجمن کو گرانٹ نہ دی جا سکی۔

ڈاکٹر باقر رقم فرماتے ہیں۔

ایک دن میں نے جامعہ ملیہ (دہلی) کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے کہا کہ آپ نیشنل گورنمنٹ سے گرانٹ لی درخواست کریں جو آپ کا حق ہے اور مولانا سے بھی ذکر کیا، انھوں نے فرمایا: "ہاں بھائی! میں منظور کردوں گا۔"

چند دن بعد میں نے ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا تو آپ نے فوراً جواب دیا۔ "نیشنل گورنمنٹ ہو یا انگریز کی حکومت، جامعہ ملیہ نے آج تک کبھی کسی حکومت کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور ایک پیسے کی امداد بھی نہیں لی۔"

میں نے مایوس ہو کر پھر مولانا سے کہا۔ آپ نے فرمایا: "میں کیا کر سکتا ہوں؟ اگر درخواست ہی نہ ہو تو گرانٹ کیسے منظور کی جا سکتی ہے۔

پھر کچھ سوچ کر کہا کہ اگر تم چاہتے ہو تو خود فائل چلا دو۔

میں نے سر جان سارجنٹ سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو کبھی دیکھا ہی نہیں، جامعہ ملیہ کا نام سنا ہے۔ ان سے ملاقات تو کراؤ، پھر فائل بھیجنا۔ اگلے روز ڈاکٹر صاحب حسب معمول ملنے آئے تو میں انھیں بتائے بغیر اپنی گاڑی میں ڈال کر سیکریٹریٹ لے گیا اور راستے میں بتایا کہ سر جان آپ کی شکل دیکھنا چاہتا ہے۔

سر جان سے آدھا گھنٹہ ملاقات رہی۔ باہر نکل کر ڈاکٹر صاحب او کھلے چلے گئے اور میں نے دفتر پہنچ کر گرانٹ کی سفارش کر دی جو منظور ہو گئی۔ یہ پہلی گرانٹ تھی جو پچاس سال کے بعد جامعہ ملیہ کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے منظور کی۔ غالباً چار پانچ لاکھ تھی۔ صحیح رقم یاد نہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر تحریر کرتے ہیں:

فقیر اپنے تجسس کی خاطر غالب کے قدیم مکان اور محلہ پھاٹک حبش خاں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی دوران ایک مطبوعہ فہرست ایسی مل گئی جس سے یہ نشان دہی ہوئی کہ مولانا

ابوالکلام آزاد پھاٹک حبش خان کے قریب مولانا سید نذیر حسین کی مسجد میں زیر تعلیم رہے ہیں اور مولانا نذیر حسین کے شاگرد......! قریب ہی مولانا نذیر حسین مرحوم کا رہائشی مکان تھا جس میں یادگار چیزیں محفوظ تھیں۔ ان میں ایک جبہ اور دستار بھی تھی جو حکومت حجاز کی طرف سے بھجوائی گئی تھی۔ غالب کا رہائشی مکان اور مولانا نذیر حسین کی مسجد وغیرہ فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے نہایت پژمردہ حالت میں تھے۔ میں نے واپسی پر مولانا سے ذکر کیا.... فرمایا:

''بھائی! تم کہاں جا نکلے اور میرا ماضی ڈھونڈ نکالا۔''

میں نے درخواست کی کہ غالب کے مکان اور مولانا نذیر حسین کی مسجد، مکان اور کتب خانے کو محفوظ کرنے کے لیے خصوصی فنڈز ملنے چاہئیں۔

مولانا نے یہ درخواست منظور کر لی۔ میں نے اگلے دن دفتر سے فائل چلا دی۔ دوسرے دن چیک موصول ہو گیا جو منتظمین کے حوالے کر دیا گیا۔ معلوم نہیں اب پھاٹک حبش خاں کے قریب مولانا نذیر حسین کی مسجد اور مکان ہے یا نہیں... رہے نام اللہ کا۔

مولانا آزاد سے مولانا نذیر حسین کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔ کہنے لگے ''آج کل کے معجزات کا میں قائل نہیں لیکن معروف ہے کہ اسی مسجد کے صحن میں مولانا نذیر حسین درس دیا کرتے تھے، جسے تم دیکھ آئے ہو۔ گلی تنگ ہے سامنے کے مکان کی سب سے اوپر کی منزل سے ایک کناسہ روز میلا پھینک دیا کرتی تھی جس کا کچھ حصہ کبھی کبھی مسجد کے صحن میں بھی آگرتا۔ مولانا نذیر حسین نے اس پر ناراضی کا اظہار کیا لیکن کناسہ باز نہ آئی۔ ایک دن مولانا نذیر حسین درس دے رہے تھے کہ کناسہ نے یہی حرکت دہرائی۔ مولانا نذیر حسین نے مکان کی چھت کی طرف دیکھا اور فرمایا۔ ''ہم نے تمھیں روکا تھا لیکن تم باز نہیں آئیں۔، لوگوں کا بیان ہے کہ اسی روز کناسہ میلا پھینکتے ہوئے اس کے ساتھ ہی گلی میں آکر گری اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

مولانا کے پرائیویٹ سکیریٹری محمد اجمل خاں صاحب اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک دن اس وقت آئے جب خواجہ عبدالحمید عرفانی میرے پاس تشریف رکھتے تھے۔ وہ اس وقت گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں انگریزی کے استاد اور وائس پرنسپل تھے۔ یہ ۱۹۴۶ء کے اواخر کی بات ہے۔ اجمل خاں صاحب سے عرفانی کا تعارف ہوا تو میں نے بتایا۔" یہ چند سال سے ایران میں عارضی طور پر ایرانیوں کو انگریزی پڑھا رہے ہیں۔ انگریز نے عارضی طور پر ان کی خدمات مستعار لی ہوئی ہیں۔ اب چوں کہ انگریز ہندوستان سے جارہا ہے، اس لیے انھیں اور دوسرے ہندی ملازمین کو ایران کی سفارتوں سے فارغ کردیا گیا ہے۔

اجمل خاں نے کہا کہ اب ایران میں ہندی سفارت قائم ہوگی تو ایسے آدمیوں کی خدمات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ان کے مشورے سے میں نے مولانا آزاد سے عرفانی کا تذکرہ کیا۔ مولانا نے عرفانی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اگلے دن عرفانی کو مولانا سے ملادیا۔ مولانا کی غبار خاطر تازہ شائع ہوئی تھی۔ مولانا نے اسے میز سے اٹھا کر عرفانی سے کہا: کہیں سے ایک آدھ باب کا فارسی ترجمہ کرلائیے....."

عرفانی کتاب لے کر گھر آگئے۔ میرے پاس ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انھوں نے اگلی صبح تقریباً ساری کتاب ترجمہ کر ڈالی۔ اجازت لے کر ہم دونوں پھر سکریٹریٹ میں حاضر ہوئے تو ترجمہ پڑھ کر مولانا عش عش کر اٹھے۔ حالاں کہ عرفانی کا خط شکستہ تھا اور اسے پڑھنا بہت مشکل تھا۔ مولانا نے اسٹینو کو بلا کر حکم لکھوایا کہ استقلال ہند کے بعد جب تہران میں سفارت ہند قائم ہو تو عرفانی کو وہاں وابستہ مطبوعاتی لگادیا جائے۔ اس پر عمل بھی ہوا، لیکن اتنے میں تہران میں سفارت پاکستان بھی قائم ہوگئی اور عرفانی پاکستان OPT (انتخاب) کر کے وہاں سے چلے گئے، پھر ساری عمر ایران میں گزار دی۔

میرے چند مسلمان احباب سیکریٹریٹ میں اونچے مناصب پر فائز تھے۔ میں سکریٹریٹ جاتا تو ان سے ملاقات ہوتی۔ فقیر نے اس دوران میں مولانا اور اپنے دوسرے وزیر پٹیل کو نہایت ایمان دار، نڈر اور اعلیٰ صفات کے حامل انسان پایا۔ پٹیل کے سپرد حکومت

ہند نے پرائمری کی لازمی مفت تعلیم کا منصوبہ کیا تھا اور ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں:

۱۹۴۷ء کے معائنے مکمل کرنے کے لیے مجھے ایک دفعہ شملہ جانا تھا۔ مولانا نے بتایا کہ وہ بھی عنقریب چند دنوں کے لیے اپنا دفتر تابستان کے لیے حسب معمول شملہ لے جا رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنا برنامہ انہی دنوں کے لیے تیار کر لیا اور اہلیہ اور بچے لے کر شملے پہنچ گیا۔ انگریز نے مرکزی حکومت کے عمال کے لیے شملہ کا گرینڈ ہوٹل اپنایا ہوا تھا جس میں چپراسی سے لے کر وزیر تک کی رہائش اور خوراک کا درجہ بدرجہ انتظام تھا۔ افسروں کا کھانا کھانے کا کمرہ ایک وسیع ہال تھا جسمیں مولانا ایک کونے میں سب سے پہلی میز پر بیٹھتے تھے۔ دفتر لڈلو کاسٹل (Ludlow Castle) میں تھا۔ پہلے دن میں سلام کے لیے بھی حاضر ہوا۔

ہم شملہ ہی میں تھے کہ انگریز نے تقسیم ملک کا اعلان کر دیا۔ مولانا نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ جوں ہی اعلان ہو، مجھے اطلاع کر دینا۔ میں تمہیں پاکستان جانے کی اجازت دے دوں گا۔ اعلان شام کی خبروں میں ریڈیو پر ہوا تو اگلی صبح کھانے کے ہال میں پہنچ کر اہلیہ نے کہا۔

''مولانا تشریف رکھتے ہیں، آپ انھیں ان کا وعدہ یاد کرائیں۔''

لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے تو میں نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ میں ان کے سامنے جا کر رکا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا:

''ہاں بھائی! اعلان ہو گیا ہے اور پاکستان بن گیا ہے۔ آپکو وہاں جانا چاہیے۔''

''میں شکریہ ادا کر کے اپنی میز پر آ گیا۔

دہلی واپس آکر میں نے اپنے انتخاب کے کاغذ مولانا کے سامنے رکھے تو آپ نے بلا تامل دستخط کر دیے۔ ہند سرکار نے اپنے تمام ملازموں کو فارم تقسیم کیے جن میں انتخاب کے تین خانے بنے ہوئے تھے۔

(۱) کیا آپ مستقل طور پر ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں؟

(۲) کیا آپ تقسیم کے بعد پہلے چھ ماہ پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں؟ یا

(۳) آپ مستقل طور پر پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ ہم جیسے لوگوں نے تیسرے خانے میں مثبت جواب پر کر دیا تھا۔

یہ تھے مولانا آزاد کے بارے میں ڈاکٹر محمد باقر مرحوم کے چند تاثرات اور مشاہدات......!

گزشتہ چند سالوں میں جتنا کچھ مولانا آزاد پر لکھا گیا ہے، اتنا ان کے کسی معاصر کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ ان کے متعلق پاکستان اور ہندوستان کے اہل قلم نے بے حد معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ہر مصنف اور ہر مضمون نگار کا اپنا انداز نگارش اور اپنا اسلوب تحقیق ہے۔ کسی نے ان کی تفسیر کو موضوع فکر بنایا اور ان کے فہم قرآن کی وضاحت کی، کسی نے ان کی عام فضیلت علمی کو اجاگر کیا، کسی نے ان کی ادبی حیثیت کو نمایاں کرنے کی سعی کی، کسی نے ان کی صحافت کے مختلف پہلوؤں کو منقح کیا، کسی نے ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی کو ہدف بحث بنایا، کسی نے ان کے عزم راسخ اور تحمل و بردباری کے واقعات بیان کیے، کسی نے ان کے سیاسی کارناموں اور برصغیر کی آزادی کے لیے ان کی بے پناہ تگ و تاز کی صراحت کی، کسی نے ان کی ان خدمات کا تذکرہ کیا جو انھوں نے آزادی کے بعد سرانجام دیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان کی مساعی کا خاص طور سے ذکر کیا، کسی نے ان کی اس جدوجہد کا جائزہ لیا جو تقسیم برصغیر کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے مختلف تدریسی اور تصنیفی اداروں کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے کی۔ مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ دہلی، مدرسہ عالیہ کلکتہ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) رامپور کی رضا لائبریری، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دیگر بہت سے اداروں کے تحفظ و استحکام کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں، وہ دوسرا کوئی شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی تفصیلات ان کتابوں میں مرقوم ہیں جو ان کی وفات کے بعد ضبط تحریر میں آئیں۔

حال ہی میں "آثار و نقوش" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے مرتب کی ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کے ان بہت سے تاریخی و

سیاسی خطوط و احکام اور ہدایات کے مجموعے کا ایک حصہ ہے جو انھوں نے ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جاری کیے۔ کتاب نہایت معلومات افزا ہے اور مکتبہ شاہد علی گڑھ کالونی کراچی نے شائع کی ہے۔

مولانا ہندوستان کے وزیر تعلیم اور وزیر امور ثقافت تھے، لیکن ان کی شخصیت ہمہ گیر اور جامع حیثیت کی حامل تھی۔ کتاب "آثار و نقوش" بتاتی ہے کہ ملک کے تمام امور پر ان کی نگاہ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ تمام مسائل خوب صورتی سے حل کیے جائیں۔ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جو فسادات ہوئے اور دونوں ملکوں کی آبادیاں ادھر سے اُدھر منتقل ہوئیں، اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں اور بے شمار مسائل ابھر آئے تھے، مولانا نے پیچیدگیاں ختم کرنے اور مسائل حل کرنے کے لیے بے حد کوشش کی۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) مشرقی پنجاب کی مسجدوں میں سکھ اور ہندو پناہ گزیں قابض ہو کر بیٹھ گئے تھے، مولانا نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ مشرقی پنجاب بھیم سین سچر کو بار بار لکھا اور ان پر زور دیا کہ مسجدیں واگزار کرائی جائیں اور پناہ گزینوں کو ان سے نکالا جائے، چنانچہ بہت سی مسجدیں واگزار کرائی گئیں۔

(۲) الور، بھرت پور اور راجستھان کے علاقوں کی مسجدوں پر بھی غیر مسلم پناہ گزینوں نے قبضہ کر لیا تھا، وہاں کی حکومت کو بھی ان مساجد کی واگزاری کے لیے متعدد بار خطوط لکھے اور اس مقصد میں انھیں کامیابی ہوئی۔

(۳) بمبئی کے بعض علاقوں کی مسجدوں میں بھی پناہ گزیں گھس گئے تھے، وہ بھی مولانا کی کوشش سے مسلمانوں کے لیے واگزار ہوئیں۔

(۴) سرہند میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی درگاہ بالکل خستہ حال ہو گئی تھی، مولانا کے کہنے سے اس کی مرمت کرائی گئی اور اسے بہتر حالت میں لایا گیا۔

(۵) ہندوستان کے مسلم اوقاف میں جو بدانتظامی پیدا ہو گئی تھی اور زبوں حالی کا

دور دورہ ہو گیا تھا، اسے مولانا نے ختم کرایا۔

(۶) ہندوستان کے مختلف علاقوں کی مساجد کے ساتھ جو جائدادیں ملحق تھیں، ان پر غیر مسلموں نے قبضہ کرلیا تھا، مولانا نے کوشش کر کے وہ جائدادیں ان کے تصرف سے آزاد کرائیں اور انھیں مسجدوں کی انجمنوں کی تحویل میں دیا گیا۔

(۷) تقسیم ہند کے بعد ایک بہت بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ جن خاندانوں کے کچھ افراد ہندوستان کی سکونت ترک کر کے پاکستان آگئے تھے اور کچھ وہیں رہ گئے تھے، ان کی جائدادوں کو متروکہ املاک قرار دے کر کسٹوڈین نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس طرح بے شمار مسلمان، ہندوستان میں رہ کر بھی اپنی جائداد و املاک سے محروم ہو گئے تھے اور ان کے پاس وہاں کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مسئلہ میں خاص طور سے دلچسپی لی اور اس دور کے وزیر آباد کاری اجیت پرشاد جین کو توجہ دلائی۔ پھر مولانا کی کوشش سے ایسا قانون بنایا گیا، جس کی وجہ سے پاکستان آنے والے خاندانوں کے ان مسلمانوں کے حقوق کا جو ہندوستان میں رہ گئے تھے، تحفظ ہو گیا اور ان کی جائدادیں انھی کے پاس رہیں۔ جن مسلمانوں کی جائدادوں پر کسٹوڈین نے قبضہ کرلیا تھا، وہ بھی انھیں واپس کر دی گئیں۔

بعض ہندو پناہ گزینوں پر اس کا شدید رد عمل ہوا تھا۔ اس کا اندازہ صوبہ سندھ سے ہندوستان جانے والے ایک مشہور سندھی لیڈر مسٹر چو یتھ رام گڈوانی کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ الفاظ یہ تھے۔

> ۲۱/ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو مسلمان مہاجرین کی جائداد کے متعلق حکومت ہند نے جو نیا آرڈی ننس جاری کیا ہے، اس کے خلاف مسٹر چو یتھ رام گڈوانی نے بہ طور احتجاج حکومت کو اپنا استعفا پیش کر دیا ہے اور دھمکی دی ہے کہ سندھی پناہ گزیں اس کے خلاف ستیہ گرہ کریں گے اور تحریک چلائیں گے اس لیے کہ حکومت ہند نے مسلمانوں کے ساتھ رعایت کر کے ملک کو

نقصان پہنچایا ہے، اور یہ رعایت مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تائید کا نتیجہ ہے جو مرکز میں وزارت تعلیم کے منصب پر فائز ہیں۔ (مولانا آزاد..... سیاسی ڈائری، ص ۴۴۳، ۴۴۴)

مولانا نے اس قسم کی دھمکیوں اور احتجاجوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کی امداد کی اور ان کے فائدے کے لیے قانون بنوایا تو بالکل صحیح کیا، اس لیے کہ مسلمان بھی اسی ملک کے باشندے ہیں، جس ملک کے باشندے غیر مسلم ہیں۔

چھوٹے اور بڑے ہر مرتبے کے لوگ مولانا کی خدمت میں جاتے اور ان سے اپنے مسائل بیان کرتے تھے۔ مولانا ہر شخص کی بات غور سے سنتے اور اس کا کام کرانے کی پوری کوشش فرماتے، اگرچہ یہ کام کسی محکمے اور وزارت سے متعلق ہوتا۔ ۱۹۵۳ء میں ہندوستان کے ریلوے وزیر لال بہادر شاستری تھے جو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے وزیر اعظم تھے اور وزیر اعظم کی حیثیت سے بعارضہ قلب اس وقت ماسکو میں فوت ہوئے جب روس کی مداخلت سے وہاں ان کا اس وقت کے پاکستانی صدر ایوب خاں سے سلسلہ گفتگو جاری تھا۔...

مولانا نے ۲۸ر اپریل ۱۹۵۳ء کو لال بہادر شاستری کے نام ایک شخص عبدالرحیم کے بارے میں مندرجہ ذیل خط لکھا۔

"عبدالرحیم نے آپ کو جو درخواست بھیجی ہے، اس کی کاپی آپ کو بھیجتا ہوں۔ یہ ریلوے میں خلاصی تھا اور پاکستان چلا گیا تھا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ چھ مہینے کے اندر اگر چاہے گا تو پھر انڈین سروس میں واپس آجائے گا۔ یہ وہاں سے واپس آگیا، لیکن پانچ برس سے بھوکا مر رہا ہے۔ اس کی درخواستوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیا آپ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ یہ کوئی ریلوے آفیسر نہیں ہے، محض انجن کا خلاصی ہے۔ کیا ایک غریب خلاصی کے لیے ریلوے میں کوئی جگہ نہیں نکل سکتی؟

اندازہ کیجیے، یہ خط کتنا زوردار اور ہمدردانہ ہے جو ایک غریب مسلمان خلاصی کی

ملازمت کے لیے لکھا گیا ہے۔

پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے مولانا نہایت محبت کے جذبات رکھتے تھے۔ جولائی ۱۹۵۳ء میں راجا غضنفر علی خاں پاکستان کی طرف سے ہندوستان کے سفیر مقرر ہو کر دہلی گئے تو مولانا نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور انھیں مبارکباد دی۔ پھر ۱۶/اگست ۱۹۵۳ء کو اتوار کے روز ساڑھے چار بجے شام انھیں چائے پر بلایا اور دونوں ملکوں کی باہمی دلچسپی کے مسائل پر گفتگو کی اور آپس میں صلح و صفائی کے ساتھ رہنے پر زور دیا۔

راجا غضنفر خاں نے ۱۷/اپریل ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔

۲۲/مئی ۱۹۵۳ء کو اس وقت کے پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو مولانا نے خط لکھا کہ:

"آپ جولائی میں مسٹر محمد علی کو دہلی بھیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کا مسئلہ ہم حل کر کے رہیں گے۔"

اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرا تھے... ملک غلام محمد اکتوبر ۱۹۵۱ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک پاکستان کے گورنر جنرل رہے۔ ۲۹/اگست ۱۹۵۶ء کو فوت ہوئے محمد علی بوگرا کے ایک خط کے جواب میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے یاد نہیں کہ کبھی کلکتے میں آپ سے ملاقات ہوئی ہو، لیکن آپ کے مرحوم نانا میرے دوست تھے، اس لیے آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہو سکتے۔ میں آپ کو تہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک نازک موقعے پر پاکستان کو صحیح لیڈ دی ہے اور پاکستان اور ہندوستان دونوں کی خدمت انجام دی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، آپ دیکھ لیں گے کہ امن، دوستی اور برادرانہ آمادگی میں اس کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔

آپ لندن میں جواہر لال سے ملیے اور پھر جولائی میں دہلی آیئے۔ پاکستان

اور ہندوستان کا پروبلم ہمیں حل کرنا ہے اور ہم حل کر کے رہیں گے۔"

محمد علی بوگرا اپریل ۱۹۵۳ء سے اگست ۱۹۵۵ تک پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے۔ ۲۳؍ جنوری ۱۹۶۳ء کو فوت ہوئے۔

مولانا کا یہ مکتوب گرامی ۲۳؍ مئی ۱۹۵۳ء کا تحریر فرمودہ ہے۔

ان دنوں پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم لندن گئے ہوئے تھے۔ وہاں جانے کی دو وجہیں تھیں۔ ایک دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت۔ دوسرے ملکہ برطانیہ الزبیتھ کے جشن تاج پوشی میں شمولیت.....!

۲؍ جون ۱۹۵۳ء کو لندن کے دی۔ ایم گرجا گھر میں ملکہ کی تاج پوشی کی تقریب منعقد ہوئی تھی اور اس کے سات روز بعد پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کی باہمی گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کی غیر موجودگی میں ہندوستان کے قائم مقام وزیر اعظم مولانا آزاد تھے، اس کا اعلان یکم جون کو سرکاری پریس نوٹ کے ذریعے کر دیا گیا تھا، جس کے الفاظ یہ تھے جو ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔

> "۳۱؍ مئی ۱۹۵۳ء کو حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد قائم مقام وزیر اعظم مقرر کیے گئے ہیں اور انھوں نے اس حیثیت سے کام شروع کر دیا ہے۔

مولانا کی بہت بڑی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو جھگڑے چل رہے ہیں، وہ جلد از جلد ختم ہوں اور دونوں ملکوں کے لوگ باہم صلح و آشتی کے ساتھ رہیں۔ انہیں جذبات کا اظہار انھوں نے اس خط میں کیا جو پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو لکھا، یہی باتیں محمد علی بوگرا کو اس وقت لکھیں جب وہ پاکستان کے وزیر اعظم بنائے گئے اور اسی قسم کی گفتگو راجا غضنفر علی سے ہوئی۔

انہی دنوں جیسا کہ پہلے بتایا گیا جواہر لال نہرو دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم

کی کانفرنس اور ملکہ الزبیتھ کی تاج پوشی کی تقریب میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے، مولانا نے انھیں لندن خط لکھ کر یہ معلوم کرنا چاہا کہ

"محمد علی سے جو باتیں ہوئیں اس کا امپریشن آپ پر کیا ہوا؟ مہربانی کر کے لکھیے۔"

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کے متنازعہ مسائل حل کرنے کے لیے کس درجہ بے تاب اور دونوں رہنماؤں کی ملاقات کے نتائج معلوم کرنے کے لیے کس قدر بے چین تھے۔

قائم مقام وزیراعظم کی حیثیت سے مولانا ۱۳ر جون کو کشمیر بھی گئے اور کشمیر کے موضوع پر سری نگر میں شیخ عبداللہ سے گفتگو ہوئی۔ اس کی اطلاع بھی جواہر لال کو لندن دی اور لکھا:

"کل شیخ عبداللہ سے دو گھنٹے باتیں ہوئیں، آج پھر ہوں گی۔"

اس سے آگے لکھتے ہیں۔

"اب باتیں اصلی پروبلم پر ہو رہی ہیں۔ کل نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے ملوں گا۔"

مولانا چاہتے تھے کہ کشمیر کا مسئلہ جو اصلی پروبلم ہے، کسی نہ کسی طرح آبرومندانہ طور سے طے ہو جائے۔ لیکن افسوس ہے ان کی زندگی میں یہ نہ ہو سکا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کیا حالات پیدا ہوتے ہیں اور معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ کوشش بہر حال جاری رہنی چاہیے۔ لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ مولانا یورپ کے پہلے سفر پر ۱۸ر مئی ۱۹۵۱ء کو بمبئی سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ ۲۱ر مئی کو لندن پہنچے اور تقریباً وسط جون تک لندن میں مقیم رہے۔ اس اثنا میں وہاں انڈیا آفس لائبریری سے متعلق معاملات پر بھی اس شعبے کے ذمہ دار حضرات سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ لندن سے مولانا پیرس تشریف لے گئے، جہاں

انھوں نے یونسکو کی چھٹی کانفرنس میں یونسکو کے نصب العین کے بارے میں ایک نہایت معلومات افزا خطبہ ارشاد فرمایا۔ پھر اٹلی، ترکی اور ایران کا دورہ کرتے ہوئے جون کے آخر میں کراچی آئے۔ یہاں چوبیس گھنٹے مقیم رہے اور قائداعظم محمد علی جناح کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور پھولوں کی چادر چڑھائی۔ اس کے بعد دہلی تشریف لے گئے۔

یہاں یہ ہلکا پھلکا لطیفہ بھی سنتے جائیے کہ جب ان کے پھولوں کی چادر چڑھانے کی خبر اخبارات میں چھپی تو عبداللہ بٹ مرحوم اور بعض دیگر حضرات نے کافی ہاؤس میں اسے ایک موضوع قرار دے لیا کہ سیاست بھی عجیب شے ہے جس نے ایک پکے وہابی کو بھی غیر وہابی اور اپنے سخت قسم کے سیاسی حریف کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے کی " بدعت "کا ارتکاب کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کافی ہاؤس میں کئی دن لطیفانہ سی گفتگو جاری رہی، جس میں متعدد حضرات اپنے فکر و خیال کے مطابق حصہ لیتے اور محفل کو گرماتے رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی انتہائی عالی ظرفی اور بے حد بلند اخلاقی تھی جس میں ایک فوت شدہ رہنما کی تکریم کا جذبہ کارفرما تھا۔ مولانا نے کبھی کسی کو کسی معاملے میں اپنا حریف نہیں سمجھا، ان کے نزدیک ہر مسئلے کی حیثیت فقط نقطۂ نظر کے اختلاف کی تھی۔

مولانا نے لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے سلسلے میں اس کے کارپردازوں سے مفصل گفتگو کی تھی۔ اس سلسلے میں ہم نے اپنے اخبارات ہفت روزہ "الاعتصام" کے ۲۲/جون ۱۹۵۱ء کے شمارے میں "مولانا آزاد کا مطالبہ" کے عنوان سے حسب ذیل ادارتی شذرہ لکھا تھا۔

> "مولانا ابوالکلام آزاد نے لندن کی ایک پریس کانفرنس میں برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ انڈیا آفس کے ہندوستانی آثار قدیمہ، جن کی قیمت کئی کروڑ تک پہنچتی ہے اور جو تاریخی اعتبار سے بھی ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں، اب ہندوستان کو واپس دیے جائیں۔

"مولانا کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان آثار قدیمہ میں ہزاروں سال قبل کی تبتی، سنسکرت، ہندی، فارسی اور عربی وغیرہ زبانوں کے باتصویر مسودات کا بھی معائنہ کیا ہے، جنھیں بغیر کسی حق کے برطانوی حکومت اپنے قبضے میں لیے بیٹھی ہے۔

"ہم پاکستان کے ارکان حکومت سے بجا طور پر پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ انھوں نے بھی ملک کی تقسیم کے بعد بارہا یورپ کی سیر کی، لندن بھی گئے اور ہر مرتبہ پرانی یادگاریں دیکھیں، کیا ان میں سے کسی نے کبھی اس اہم معاملے کی طرف توجہ کی؟ کیا ان کے نزدیک انڈیا آفس کے آثار قدیمہ میں پاکستان کا کوئی حصہ نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو وہ اسے کیوں مرکز التفات نہیں ٹھہراتے؟ اور کیوں برطانیہ سے اپنے ان گراں بہا ثقافتی خزائن کا مطالبہ نہیں کرتے؟

"جب یہ ملک اس بات کا مدعی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت کا مظہر ہے تو پھر کیوں ہندوستان کے ان مسلمان سلاطین کی یادگاروں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جو آثار قدیمہ کے طور پر انڈیا آفس میں مقفل پڑی ہیں؟ ہندوستان کے وزیر تعلیم کی طرح کیا پاکستان کے وزیر تعلیم بھی ان ذخائر کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں۔"

مولانا کے اس مطالبے کے بعد اس سلسلے میں بہت سے پاکستانی اخباروں نے لکھا تھا اور حکومت سے کہا تھا کہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتی یا کرنا نہیں چاہتی تو کم از کم یہی کرے کہ ہندوستان کے وزیر تعلیم سے رابطہ قائم کر کے ان سے کہا جائے کہ اس مسئلے میں دونوں ملک مشترکہ قدم اٹھائیں۔ اس وقت پاکستان کے وزیر تعلیم کرنل عابد حسین تھے، اس ضمن میں مولانا ابوالکلام سے گفتگو کرنے کے لیے انھیں دہلی بھیجا گیا۔ لیکن دونوں ملکوں کے وزرائے تعلیم کے درمیان اس نہایت اہم مسئلے سے متعلق کیا گفتگو ہوئی اور کس

انداز سے ہوئی۔ ہمارے وزیر تعلیم نے مولانا سے کیا فرمایا اور انھوں نے کیا جواب دیا، اس کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا جون ۱۹۵۱ء کے آخر میں مولانا یورپ کے دورے سے واپسی پر دہلی جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے کراچی رکے تھے۔ اس کا ذکر ہم نے ۷ ؍ ۲ ؍ جولائی ۱۹۵۱ء کے الاعتصام میں "تاریخ کا ایک زریں باب... ابوالکلام" کے عنوان سے ایک مختصر سے مضمون میں کیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے بعض حصے یہاں درج کر دیے جائیں۔ اس سے ان علماء کرام کے اخلاق کا بھی پتا چلے گا جو اس وقت کراچی میں تشریف فرما تھے اور حکومت کا کردار بھی سامنے آجائے گا.... ملاحظہ فرمایئے: "تنگ دلی و تنگ ظرفی کسی قوم کا اچھا کردار نہیں ہو سکتا۔ یہ کس درجہ افسوس ناک بات ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد بائیس گھنٹے کراچی میں تشریف فرما ہیں اور پاکستان کے ارباب حکومت کو ان کے خیر مقدم کی سعادت حاصل نہ ہو۔ نہ کراچی کے علمی و ثقافتی اداروں کی طرف سے انہیں دعوت دی جائے اور نہ کارپوریشن کو یہ توفیق نصیب ہو کہ ان کے اعزاز میں عصرانہ یا عشائیہ ترتیب دے سکے۔

> "مولانا کی حیثیت ہر گز ایک مقامی اور اقلیتی قائد کی نہیں، بلکہ ان کا شمار مشرق کے ان مایہ ناز حضرات میں ہوتا ہے، جن کے علم و ادب اور ثقافت واخلاق پر پوری دنیائے اسلام ناز کر سکتی ہے۔ یہی وہ گراں قدر شخصیت ہیں جن کے شور قلم سے متحدہ ہندوستان میں پہلے پہل بیداری پیدا ہوئی، جن کے "الہلال" اور "تذکرہ" سے اسلامی ذہن ابھرا، جن کے "ترجمان القرآن" سے لوگوں کے دلوں میں اسلامیات سے حقیقی دلچسپی پیدا ہوئی اور جن کی قربانیوں اور ایثار سے آزادی کی دولت نے ہندوستان اور پاکستان کو مالا مال کیا۔ مولانا کا ذہن اس وقت بیدار ہوا اور ان کے قلب سلیم نے انگریزی کی غلامی سے اس وقت توحش محسوس کیا، جب متحدہ ہندوستان کی اکثریت نے انگریز کی تقلید و اطاعت شعاری کے "طوق زریں" کو زیب گلو کر رکھا تھا۔

''مولانا کا تدبر'' مولانا کا استقلال اور اونچا کیریکٹر ہر شخص سے خراج تحسین وصول کرے گا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان کے افکار نکھرتے جائیں گے اور ان کے محاسن سے لوگوں کو آگاہی حاصل ہوتی جائے گی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں پاکستان سے نظری اختلاف تھا اور سب جانتے ہیں کہ وہ اختلاف اس وقت تک تھا جب تک کہ پاکستان نے حقیقت محسوسہ کی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ جوں ہی بٹوارے کا اعلان ہوا اور پاکستان معرض ظہور میں آیا، مولانا نے اپنا انداز بدل لیا، اور شاید وہ پہلے سیاست دان ہیں، جنھوں نے یہ مشورہ دیا کہ اب پاکستان کے مسلمانوں کو کانگریس سے کوئی عملی تعلق نہیں رکھنا چاہئے اور مسلم لیگ کو اپنی سیاسی جماعت ماننا چاہیے۔ اس کے بعد ان پانچ کروڑ مسلمانوں کے عزم و حوصلے کو بلند کرنے کے لیے، جنھیں پاکستان کی وجہ سے لازماً ہدف مصائب بننا پڑا، مولانا نے جو کوششیں کیں، تاریخ ان کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔

''مولانا کی حیثیت ایک موسسہ اور عملی ادارے کی ہے، یہی وجہ ہے کہ سوا پاکستان کے وہ جہاں گئے، ان کا خیر مقدم ہوا اور ہر ملک کے اکابر اور علمی شخصیتوں نے ان کا استقبال کیا۔ نہایت افسوس ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی پاکستان کے اکابر کے ذہنوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور رسمی اخلاق تک پیدا نہیں ہوئے... ابوالکلام آزاد کے بارے میں یہ بخل اور تنگ ظرفی ہمارے اندر کیوں ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ مسلمان ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں اور ہم ان سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا انتقام لینا چاہتے ہیں؟ یاد رہے کوئی اونچے اخلاق کا مسلمان اس طرز عمل سے خوش نہیں ہو سکتا۔ ہمیں پہلی رنجشیں ایک بہادر اور بااصول مسلمان کی طرح یکسر بھلا دینی چاہئیں۔ اور ابوالکلام آزاد داد کے

مستحق ہیں کہ ان کا ذہن ہر قسم کی رنجشوں اور کدورتوں سے پاک ہے۔

"اس کے باوجود کہ ملک تقسیم ہو گیا ہے اور بٹوارے کی زبردست لکیر نے ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، لیکن علم نہیں بٹا ہے، اسلامی اخلاق و ثقافت کی میراث تقسیم نہیں ہوئی ہے اور تاریخ کے ان اوراق کو پھاڑ ڈالنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے، جن کا ایک زریں باب ابوالکلام ہے۔

"حکومت پاکستان کے سرکاری اداروں کی طرف سے اس بارے میں اگر افسوس ناک تغافل ہوا ہے تو ہمیں اس پر تعجب نہیں، لیکن کراچی کے علما اور بے شمار علمی وادبی حلقوں کو کیا ہو گیا کہ یہ بھی اپنے ہاں ابوالکلام کو نہیں بلا سکے۔ کیا علم اب انتار و بہ انحطاط ہو گیا ہے اور اخلاقی گراوٹ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اس خالص ادبی و دینی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے بھی ارباب اختیار کے اشارۂ چشم و ابرو کا انتظار رہتا ہے؟ کیا یہ وہی کراچی ہے جو پاکستان کا سب سے بڑا مرکز ہے اور عالم اسلام کا دماغ ہے؟ اگر یہاں کی مجبوریوں اور سرد مہریوں کا یہ حال ہے تو پھر توقع کس سے رکھی جائے؟ کیا یہ وہی کراچی ہے جہاں ادارہ اسلامیات بھی ہے؟ جہاں بڑے بڑے علمی اداروں اور مدارس کی بنیاد رکھی جارہی ہے؟ اور کیا یہ وہ بلدۂ طیبہ ہے جہاں تصوف کے بڑے بڑے پیشہ ور جمع ہیں؟ کیا ان سے یہ بھی نہیں ہو سکا کہ اس دور کی اہم اسلامی شخصیت کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کر لیتے؟

"یاد رہے، اس سے ابوالکلام کی قطعاً توہین نہیں ہوئی۔ اس کا کام اور اس کی علمی وادبی خدمات اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گی، لیکن ان بدلے ہوئے حالات میں بھی ہمارے اصحاب علم اور ارباب اختیار نے جو معاملہ ان سے کیا ہے، اسے ہمیشہ تنگ دلی ہی کہا جائے گا۔ تعجب ہے وہ لوگ بھی مولانا آزاد کے

بارے میں باتیں کرتے ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کو تقدیر کے حوالے کر
کے تنہا چھوڑ آئے تھے۔"

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے جن فضائل و کمالات سے نوازا تھا، وہ فضائل و کمالات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پوری تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے آرہے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے انداز کے وہ واحد شخص تھے اور جو خصوصیات بارگاہ خداوندی سے انھیں عطا فرمائی گئی تھیں، ان میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ۱۹۲۰ء کے بعد مولانا نے اپنا راستہ بدل لیا تھا اور ان کے افکار پہلے سے نہیں رہے تھے..... یہ بالکل غلط بات ہے اور حالات سے عدم واقفیت اور مولانا کے افکار سے لاعلمی کی دلیل ہے۔ مولانا نے جو راستہ ابتدا میں اپنے لیے منتخب کر لیا تھا، آخر تک وہ اسی پر چلتے رہے۔ وہ راستہ تھا، ملک کو آزاد کرانے کا، مسلمانوں کی علمی اور فکری تربیت کا، اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا، مشکل سے مشکل حالات میں لوگوں کو صحیح سمت پر قائم رہنے کی تلقین کرنے کا اور کسی کی پروا کیے بغیر صحت مندانہ نقطہ نظر کی وضاحت کا ..... اس راستے سے وہ ایک انچ بھی ادھر اُدھر نہیں ہوئے۔

۱۹۲۰ء کے بعد انھوں نے تفسیر ترجمان القرآن لکھی، اخبار "پیام" جاری کیا، عربی کا پندرہ روزہ "الجامعہ" جاری کیا' "البلاغ" جاری کیا، تحریک خلافت میں حصہ لیا آزادی ملک کے فیصلہ کن مرحلے طے کیے اور قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں، کرپس مشن سے ملاقاتیں ہوئیں، برطانوی وزارتی مشن سے گفتگو کے طویل سلسلے چلے، عارضی حکومت قائم ہوئی اور پھر وزارت تعلیم و ثقافت کا زمانہ آیا، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی بے پناہ خدمت کی۔

مولانا پر اعتراض کرنے والے تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے حوالے کر کے پاکستان آگئے تھے، اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کا سہارا مولانا ہی تھے اور وہ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے مولانا کے پاس آتے تھے اور جس محکمے سے کام کا تعلق ہوتا، مولانا اس

محکمے کے سربراہ سے رابطہ پیدا کر کے کام کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کے لیڈر مسلمانوں کے مخدوم ہیں اور مخدوموں کی یہاں لائینں لگی ہوئی ہیں..... اور مولانا آزاد ہندوستانی مسلمانوں کے خادم تھے۔

مولانا آزاد برصغیر کے مسلمانوں کے بہت بڑے خادم اور بہت بڑے خیر خواہ تھے اور ان کی خدمت اور قربانیوں کا دائرہ بہت وسیع بلکہ ہمہ گیر تھا، جس کی ایک جھلک گزشتہ سطور میں قارئین کرام کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحریک پاکستان سے مولانا ابوالکلام آزاد کو شدید اختلاف تھا۔ ان کے نقطہ نظر کی رو سے پاکستان کا قیام ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسائل کا حل نہ تھا، ان کا خیال تھا کہ اس سے الجھنیں بڑھیں گی اور نئے مسائل پیدا ہوں گے جو پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث بنیں گے، لیکن جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، پاکستان معرض قیام میں آگیا تو انھوں نے ہر موقعے پر اس کی حمایت کی اور دونوں ملکوں کے باشندوں پر زور دیا کہ وہ پاکستان کی حمایت کریں اور اسے مضبوط بنانے کے لیے کوشاں ہوں۔ اس لیے کہ برصغیر کے عوام بالخصوص اس خطے کے مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ پاکستان مضبوط اور مستحکم ہو اور دونوں ملک صلح و آشتی سے رہیں۔ لیکن یہ حیران کن بات ہے کہ پاکستان کے بعض بزرجمہر اس کے باوجود ابوالکلام آزاد کے مخالف ہیں۔ وہ مر گیا ہے، اور اس کی سیاست ختم ہو گئی ہے لیکن یہ اب بھی اس کی پچاس سال قبل کی سیاست سے خوف زدہ ہیں.... اس کے برعکس جو لوگ تحریک پاکستان کے زمانے میں بھی اس تحریک کے مخالف تھے اور قیام پاکستان کے بعد بھی اس کے مخالف رہے اور مخالف ہیں اور اس کے رہنماؤں کے خلاف انھوں نے کتابیں لکھیں اور یہ تحقیق ہنوز جاری ہے اور مسلم لیگ کے موجودہ رہنماؤں کو یہ تحقیق جاری رکھنے کی دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں، وہ ان کے دوست اور حلیف قرار پائے...... افسوس ہے ان پر جن کے ذہن مخالف اور موافق کو پہچاننے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں۔

میرے دور ادارت میں ہفت روزہ ”الاعتصام“ کے ۶/ اکتوبر اور ۱۴/ اکتوبر ۱۹۶۰ء کے دو شماروں میں ایک بزرگ مولانا حکیم عزیزالرحمان اعظمی عمری (جامعہ دارالسلام عمر آباد، مدراس، ہندوستان) کا ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا، جس کا عنوان تھا ”تفسیر ترجمان القرآن کا انتساب“۔ یہ نہایت دلچسپ مضمون ہے اور بہت سی معلومات پر حاوی.... ! اس میں بتایا گیا ہے کہ جس صاحب علم کی وساطت سے یہ انکشاف ہوا (کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جس شخص کی طرف اپنی تفسیر ترجمان القرآن کا انتساب کیا ہے، ان کا نام مولوی دین محمد قندھاری ہے) یہ انکشاف کرنے والے بزرگ علاقہ سوات (صوبہ سرحد) کے رہنے والے تھے اور ان کا نام تھا مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی.... حکیم صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے عقیدت مند تھے اور مولانا کو مولوی دین محمد قندھاری کا نام انہی نے بتایا تھا.... یہ بات تو اب راز نہیں رہی، اس کا بہت سے اہل علم کو پتا چل چکا ہے، لیکن اس مضمون میں اور بھی بہت سی علمی اور سیاسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو دور گزشتہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہذا مناسب سمجھا گیا کہ یہ مضمون جو آج سے اڑتیں (۳۸) برس قبل ”الاعتصام“ میں شائع ہوا تھا اور جو درحقیقت مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ہے، یہاں بھی درج کر دیا جائے۔

حکیم فضل الرحمان سواتی دسمبر ۱۹۶۳ء کے پہلے ہفتے پاکستان تشریف لائے تھے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ملے تھے۔ مولانا اس وقت گلاب دیوی ہسپتال میں داخل اور ڈاکٹر بلیغ الرحمٰن کے زیر علاج تھے.... اب ذیل میں یہ طویل اور پر از معلومات مضمون ملاحظہ فرمایئے۔

”مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عظیم الشان تفسیر ”ترجمان القرآن“ کی پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں شائع کی تھی۔ اسے ایک ایسے شخص کی طرف منسوب کیا جو کچھ دن مولانا کی خدمت میں رہا، ان سے فیض حاصل کرتا رہا اور پھر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ مولانا کو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انتساب کے الفاظ یہ ہیں۔

"غالباً دسمبر 1918ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشا کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔

آپ مجھے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ہاں جناب! میں بہت دور سے آیا ہوں۔

کہاں سے؟

سرحد پار سے......!

یہاں کب پہنچے؟

آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے، انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچادیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کے آیا ہوں۔

افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟

اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے "الہلال" اور "البلاغ" کا ایک ایک حرف پڑھا۔

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا کہ میں اسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔ مجھے اسکا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

ابوالکلام آزاد، ۱۲/ ستمبر ۱۹۳۱ء، کلکتہ

مولانا کے عقیدت مندوں کو تو ان کے اس بیان میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی، مگر جب سے خاص طور پر مولانا کے خلاف بعض غلط اندیش افراد نے شورش بپا کر رکھی ہے، اس انتساب کے متعلق بھی انھوں نے چہ می گوئیاں شروع کر دی ہیں۔ بعض نے طنز کے طور پر کہا کہ مولانا کو تاریخ یاد رہ گئی مگر اس شخص کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مولانا نے محض اپنی قدر و منزلت کو اپنے قلم سے اونچا کرنے کے لیے ایک بات لکھ دی ہے۔

بعض بڑے بڑے حضرات کی طرف سے بھی اس قسم کے طعنے ہوتے رہے، مگر کسی کو یہ توفیق نہیں ہو سکی کہ اس شخص کا نام معلوم کرنے کے لیے کچھ دوسرے ذرائع اختیار کرے۔ طویل عرصہ یوں ہی گزر گیا۔ اس حقیقت کا سراغ ملا تو ایک ایسی کتاب کی بہ دولت جو تالیفی دنیا میں بے نظیر شمار کی جا سکتی ہے۔ یعنی افضل العلما مولانا حافظ ڈاکٹر محمد یوسف کوکن صاحب عمری ایم۔ اے ریڈر اردو، فارسی عربی مدراس یونیورسٹی (مدراس) نے "امام ابن تیمیہ" کے نام سے ایک لاجواب کتاب تصنیف کی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف رہنے والے تو مینمبور کے تھے جو مشہور قلعہ جنجی جنوبی آرکاٹ سے ڈھائی میل پر خالص مسلمانوں کی بستی ہے، لیکن انھوں نے "جامعہ دار السلام عمر آباد" میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی آٹھ سال تعلیم پائی۔

جامعہ کے قائم ہونے کے دوسرے ہی سال ۱۹۲۵ء میں جامعہ میں داخل ہوئے تھے۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ اول آتے رہے۔ آخر سال بھی اول آئے اور ایک تمغہ بھی حاصل کیا۔ وہ پہلے "عمری" (یعنی جامعہ دار السلام کے فارغ التحصیل) تھے، جنھوں نے ۱۹۳۴ء کے میٹریکولیشن کے انگریزی امتحان میں شان دار کامیابی حاصل کی۔ اطراف و اکناف کے انگریزی طلبا شرطیں لگایا کرتے تھے کہ وہ ہر گز ہر گز انگریزی امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مگر اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔

حافظ محمد یوسف کوکن کا خیال طب اور ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ مگر جامعہ دار السلام کے بانی اور سکریٹری خان بہادر ساہوکار کاکا محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم

نے انھیں مجبور کر کے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی خدمت میں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) روانہ کر دیا۔ سید صاحب موصوف نے انھیں تحقیق کے لیے امام ابن تیمیہ موضوع دیا، مگر اس موضوع پر مکمل ریسرچ نہ کرپائے تھے کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی اور الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کا اور پھر مدراس یونیورسٹی سے بی۔ اے پھر ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

دارالمصنفین کے دوران قیام میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر مدراس یونیورسٹی ہی میں شعبہ ریسرچ میں ملازمت اختیار کی۔ یونیورسٹی نے ان کے ذریعے مورلینڈ اور چیٹر جی کی تاریخ ہند کا ترجمہ اور اس کے بعد ڈاکٹر الیس کیرل کی مشہور کتاب ''مین دی ان نون'' کا ترجمہ کرا کے شائع کیا۔ موخر الذکر کتاب میں ''نامعلوم انسان'' کی زبان و بیان کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔ پھر جنوبی ہند کے مشہور علما مولانا باقر آگاہ، مولانا سید عبدالقادر شاہ مہربان فخری، ملک الشعرا میر اسمٰعیل خان ابجدی، نواب غلام اعزالدین خان بہادر مستقیم جنگ کی مختلف تصنیفات، مقدمات اور حواشی کے ساتھ شائع کرائیں۔ گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری مدراس کے زیر اہتمام ملا جلال الدین دوانی کی کتاب ''شواکل الحور'' عربی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کی۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی اس اثنا میں انھیں ''امام ابن تیمیہ'' کی اشاعت کی طرف توجہ دلاتے رہے، لیکن اس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب سید صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ کتاب مکمل ہو جانے کے بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں پیش کر کے ان سے مقدمہ یا تعارف لکھوائیں گے، مگر سید صاحب کی اس خواہش پر عمل نہ ہو سکا کیوں کہ ڈاکٹر محمد یوسف کوکن کو مصر کا سفر درپیش آگیا اور وہ مصر ہی میں تھے کہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد انتقال فرماگئے۔ اپریل کے آخر میں کوکن صاحب ہندوستان واپس آئے اور اپنی کتاب مکمل کر کے شائع کی۔

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے اسکے متعلق تعریفی اور تہنیتی خطوط

پہنچنے لگے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ۱۸ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن سے اس پر شان دار تبصرہ نشر کیا۔ ڈاکٹر خان عبداللطیف صاحب نے کویت سے ایک تعریفی خط لکھا اور کتاب کی دس کاپیاں خرید کر مختلف مدرسوں اور کتب خانوں کو تحفتاً بھیجیں۔ صوفی نذیر احمد کاشمیری نے تو یہاں تک تحریک کی کہ جلالۃ الملک سعود والی نجد و حجاز اس کی پانچ دس ہزار کاپیاں چھپوا کر سارے ہندوستان میں تقسیم فرمائیں... ہفت روزہ "الاعتصام" (لاہور) نے کئی صفحوں کا اس پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت ہی تعریف کی۔

ڈاکٹر محمد یوسف کوکن کی اس کتاب کا عالی جناب مولانا حکیم فضل الرحمٰن صاحب سواتی ثم آمبوری نے بھی بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا اور مصنف کو ایک پراز معلومات خط لکھا۔ یہ خط اگرچہ نجی تھا مگر چوں کہ اس کے ذریعے سے ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہو رہا تھا، اس لیے ڈاکٹر کوکن صاحب نے اسے ماہنامہ "برہان دہلی میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔

"برہان" کے مدیر محترم نے حسب ذیل نوٹ کے ساتھ یہ خط شائع فرمایا:

"افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن ایم۔اے نے حال ہی میں حافظ ابن تیمیہ پر ایک بڑی ضخیم کتاب شائع کی ہے۔ اس کو پڑھ کر آمبور علاقہ مدراس کے ایک نامور فاضل مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی نے موصوف کو ایک طویل خط لکھا تھا، جس میں مذکورہ بالا کتاب سے متعلق رائے کے اظہار کے علاوہ حکیم صاحب نے ضمناً اس شخص کی بھی نشاندہی کر دی جس کے نام مولانا آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" کو معنون کیا ہے۔ چونکہ یہ انکشاف بہت اہم ہے اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے خط کے فاضل مکتوب الیہ اور کاتب کے شکریے کے ساتھ ہم اسے شائع کرتے ہیں۔"

(برہان، دہلی، بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء)

یہ خط چونکہ بہت اہم تھا،اس لیے سہ روزہ مدینہ (بجنور) ہفت روزہ "الکلام" (پٹنہ) اور دوسرے اخبارات میں نقل ہوتا رہا۔اس کی وجہ سے قارئین کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ تاہم اس سلسلے میں مزید وضاحت کی ضرورت تھی،اب خاک سار نے حکیم فضل الرحمٰن سواتی سے ملاقات کی اور مزید معلومات حاصل کیے جو قارئین "الاعتصام" کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

ہمیں دراصل ڈاکٹر کوکن اور حکیم صاحب دونوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی بہ دولت ایک اہم حقیقت منظر عام پر آگئی...... کوکن صاحب کا شکریہ اس لیے کہ انھیں کی کتاب "امام ابن تیمیہ" اس حقیقت کے منکشف کرنے کا موجب بنی۔اگر یہ عظیم الشان تالیف شائع نہ ہوتی تو یہ حقیقت منظر عام پر نہیں آسکتی تھی.... حکیم صاحب کا شکریہ اس لیے کہ انھوں نے مولانا آزاد کا راز ایک نجی خط میں ظاہر کیا۔اگر انھیں معلوم ہوتا کہ یہ خط شائع ہوگا تو شاید وہ اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتے، جسے خود مولانا آزاد پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے....اب میں حکیم صاحب کے متعلق بھی کچھ توضیح کردینا چاہتا ہوں۔

حکیم فضل الرحمٰن علاقہ سوات ایجنسی مالاکنڈ موضع تھانہ کے باشندے تھے،وہ ۴ر شوال ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء کو چہار شنبہ کے روز پیدا ہوئے۔ گھر پر کچھ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف اساتذہ اور نامی گرامی علما سے جو خاص خاص فن میں کمال رکھتے تھے، تعلیم پائی...... افغانستان، قبائل سرحد، پشاور، مردان، کوہاٹ، بنوں اور علاقہ ہزارہ میں اس وقت علوم عربیہ کا شاید کوئی باقاعدہ مدرسہ تو نہیں تھا،البتہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی عالم رہتے تھے، جن کے درس کا سلسلہ جاری تھا اور طلبا ان سے تعلیم پاتے تھے۔کوئی علم صرف کا عالم تھا،کوئی علم نحو کا۔کوئی منطقی تھا،کوئی فلسفی تھا،کوئی فقیہ تھا،کوئی اصولی۔کسی کو علم معانی و بیان میں کمال حاصل تھا،کسی کو علم کلام میں۔ بعض ان تمام علوم میں دست گاہ رکھتے تھے۔حکیم صاحب نے قدیم طرز تعلیم کے مطابق اساتذہ وقت اور خاص کر مولوی عبدالحنان نعمانی سے منقولات و معقولات کی تعلیم حاصل کی۔اس زمانے میں اکثر کتابوں کے متون حفظ کرائے جاتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حکیم صاحب کو مختلف کتابوں کے

متن از بر تھے اس کے علاوہ انھیں فارسی ادب سے بھی بڑی گہری دلچسپی تھی۔ سیکڑوں عمدہ اشعار ان کے نوک زبان تھے اور بات بات میں دلچسپ اور لطیف اشعار پیش کرتے تھے۔

حکیم صاحب ۱۹۰۷ء میں مولوی عبدالحنان نعمانی سے فلسفے کی مشہور کتاب "میبذی" پڑھ رہے تھے کہ وحدۃ الوجود کی بحث میں امام ابن تیمیہ کے عقائد و خیالات کا ذکر آگیا۔ مولوی عبدالحنان صاحب نے ان پر سخت تنقید کی اور کہا کہ ابن تیمیہ اصحاب ظواہر میں سے ہیں اور ان کی ظاہری آنکھ حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ مولوی عبدالحنان نعمانی فلسفہ و منطق کے اس وقت زبردست عالم مانے جاتے تھے۔ ان فنون میں اس نواح میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا اس لیے جلیل القدر استاد کا حکیم صاحب جیسے فرمان بردار شاگرد پر اثر پڑنا ضروری تھا۔ تقلیداً حکیم صاحب بھی امام ابن تیمیہ کے سخت مخالف ہو گئے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء کے ابتدا میں حکیم صاحب دہلی تشریف لائے۔ اس وقت مولوی دین محمد قندھاری دہلی کے مدرسہ نعمانیہ میں مولانا پردل قندھاری کے پاس آخری درجے میں پڑھ رہے تھے۔ حکیم صاحب اور انکے درمیان طالب علمانہ دوستی تھی۔

حکیم صاحب نے دہلی کے مدرسہ طبیہ میں جو آگے چل کر طبیہ کالج بنا، داخلہ لیا۔ اس وقت اس مدرسے میں زبدۃ الحکماء حکیم کبیر الدین صاحب کا تعلیم کا آخری سال تھا، اور تمام طلبا میں وہ ممتاز درجے پر فائز تھے۔ حکیم صاحب کا زیادہ میل ملاپ حکیم کبیر الدین سے رہا۔ حکیم صاحب تقریباً ایک سال دہلی رہے۔ ۱۹۱۲ء کے آغاز میں وہ لکھنؤ گئے اور ۱۹۱۵ء تک (تین سال) وہاں مقیم رہے۔

۱۹۱۳ء میں مولوی دین محمد قندھاری کان پور سے لکھنؤ پہنچے اور حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا کہاں سے آرہے ہو؟ جواب دیا کان پور گیا تھا۔ ایک مہینہ وہاں کے مدرسہ الٰہیات میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اب وہیں سے آرہا ہوں۔ حکیم صاحب نے کہا استغفر اللہ۔ کہاں آپ اور کہاں کان پور کا مدرسہ الٰہیات۔ اس مدرسے کے تو اساتذہ بھی آپ سے استفادے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

مولوی صاحب نے کہا: چپ رہو، بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں مولوی عبدالباری فرنگی محلی نے مولوی دین محمد قندھاری کو اپنے مدرسہ نظامیہ کا استاذ مقرر کرلیا۔ چند مہینے انھوں نے وہاں تدریسی خدمات سرانجام دیں، اس کے بعد وہ شاہجہاں پور چلے گئے۔

مولوی دین محمد قندھاری کو "الہلال" سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھوں نے لکھنؤ میں "الہلال" خریدا اور حکیم صاحب کے پاس آئے۔ ان سے کہا یہ مضمون پڑھو۔ حکیم صاحب نے کہا میں تو اردو پڑھ نہیں سکتا... مولوی صاحب نے کہا یہ اردو نہیں ہے بلکہ وہی زبان ہے جسے تم سمجھ سکتے ہو۔ یہ کہہ کر انھوں نے حکیم صاحب کو پورا مضمون پڑھ کر سنایا۔ پھر پوچھا: سمجھ گئے ہو؟ حکیم صاحب نے جواب دیا سمجھ گیا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا یہ اخبار نہیں ہے بلکہ بہت بڑا معلم ہے، اس کا باقاعدہ مطالعہ جاری رکھو... حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے بعد مجھے "الہلال" پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

جب ۱۹۱۴ء میں عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو اس کے ایک سال بعد یہی حکیم فضل الرحمٰن صاحب سرحد پار کے مجاہدین کی جماعت میں شریک ہوگئے۔ تین مرتبہ انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ پھر وہ افغانستان کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں حکیم صاحب نے "سراج الاخبار" افغانیہ کابل کے دفتر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفت روزہ "البلاغ" دیکھا، جس میں مولانا کا "تین اور زیتون" کی تفسیر پر معرکہ آرا مضمون شائع ہوا تھا یہ مضمون پڑھ کر حکیم صاحب نہایت متاثر ہوئے۔ مولانا نے اس مضمون میں رازی پر تنقید کی تھی اور امام ابن تیمیہ کی بڑی تعریف کی تھی۔ حکیم صاحب چاہتے تھے کہ اپنے استاد مولوی عبدالحنان نعمانی کو بھی اس کا قائل کرائیں، چنانچہ انھوں نے جناب محمود طرزی ایڈیٹر "سراج الاخبار" سے "البلاغ" کے تینوں شمارے جن میں مولانا آزاد کا یہ مضمون چھپا تھا، عاریتاً لیے اور کابل سے چار دن کی مسافت پیدل طے کر کے نعمان پہنچے اور اپنے فاضل استاد کی خدمت میں یہ شمارے پیش کیے۔ مولوی صاحب نے مضمون پڑھا تو بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ مولانا

آزاد بڑے جری اور حق گو معلوم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

پھر مولوی عبدالحنان نے خود ہی بیان کیا کہ ابوالکلام آزاد کے متعلق مولوی دین محمد قندھاری جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس واقعہ سے دو تین مہینے پیشتر مولوی دین محمد قندھاری اپنے استاد مولوی عبدالحنان صاحب کی خدمت میں موضع نعمان پہنچے تھے اور مولانا آزاد کی ان کے پاس بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ وہ کلکتے جاکر مولانا آزاد کے "دارالارشاد" میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اس وقت مولوی عبدالحنان صاحب نے ان سے کہا تھا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو، اس قدر علم و فضل کے باوجود ایک معمولی اخبار نویس (یہ مولانا آزاد ہی کی طرف اشارہ تھا) کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنا چاہتے ہو.... مولوی دین محمد قندھاری نے جواب دیا آپ نے ان کی تحریریں پڑھی نہیں ہیں، ورنہ آپ ان کے متعلق اس طرح کے الفاظ استعمال نہ کرتے۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد حکیم فضل الرحمٰن صاحب ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کے سلسلے میں مدراس پہنچے۔ وہ پکے کانگریسی تھے۔ آزادی کی ہر تحریک میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ عمر آباد کے متصل مشہور تاریخی مقام گڑھ آمبور کے ایک معزز گھرانے میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ تاہم انھوں نے آزادی کی کسی تحریک میں شامل ہونے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ جب نان کو آپریشن یعنی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو حکیم صاحب بھی ۱۹۲۲ء میں جیل گئے اور ویلور اور کڈلور کے قید خانوں میں ایک سال قید کی مدت کاٹی۔ جب وہاں سے رہا ہوئے تو وانمباڑی میں مقیم رہے۔ کبھی کبھی عمر آباد بھی تشریف لے جاتے تھے اور جامعہ دارالسلام میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔

جامعہ سے ان کی دلچسپی اس وقت بہت بڑھ گئی تھی، جب وہاں حضرت مولانا عبدالوہاب آروی صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لائے۔ دونوں معقولی تھے اور مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ دونوں کے درمیان جاری رہتا تھا۔ ایک دفعہ کسی مسئلے پر تین دن مباحثہ ہوتا رہا اور فیصلہ حکیم صاحب کے حق میں ہوا۔ مولانا آروی کہا کرتے تھے

کہ حکیم فضل الرحمٰن واقعی بہت بڑے معقولی ہیں۔ اور حکیم صاحب کا فرمان تھا کہ میں نے اہل حدیث علما کے حلقے میں مولانا عبدالوہاب آروی جیسا متبحر عالم اور معقول و منقول پر حاوی شخص نہیں دیکھا۔ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی قابلیت اور علمی صلاحیتوں کے کھلے دل سے معترف بلکہ بے حد مداح تھے۔

حضرت مولانا عبدالوہاب آروی جامعہ سے تشریف لے گئے تو معقولات کی تعلیم کے سلسلے میں وہاں حالات موزوں نہ رہے۔ لہٰذا جامعہ کے ناظم حضرت مولانا فضل اللہ صاحب کی اس کے لیے نظر انتخاب حکیم فضل الرحمٰن سواتی پر پڑی اور حکیم صاحب نے از راہ کرم ناظم صاحب کی درخواست قبول فرمائی اور پھر جامعہ میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم طب کا شعبہ بھی قائم کر دیا گیا اور یہ دونوں شعبے حکیم صاحب کے سپرد ہوئے۔ ان فنون میں طلبا نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

حکیم فضل الرحمٰن تھوڑا عرصہ ہی عمر آباد میں رہے۔ اس کے بعد کانگریس کی نمک تحریک شروع ہو گئی اور وہ جامعہ سے استعفادے کر اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ جناب سیٹھ یعقوب حسن کو ان کی سیاست سے اتفاق نہ تھا۔ انھوں نے ان سے کہا کہ وہ تدریس کے اہم کام کو چھوڑ کر کسی سیاسی تحریک میں شرکت نہ کریں لیکن حکیم صاحب پر کانگریس کا ایسا نشہ چڑھا ہوا تھا کہ وہ کسی ترشی سے اتر نہیں سکتا تھا۔ وہ مدراس سے بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی کے قیام کے متعلق خود انھی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

> "۱۹۳۱ء میں مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے کینٹ قصوری نے جو میرے محسن اور کرم فرما تھے، مجھے بمبئی میں مطب کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے پیہم اصرار پر میں نے دواخانہ بھنڈی بازار میں قائم کر دیا۔ دواخانے کے تمام اخراجات کے کفیل مولوی محمد علی صاحب بنے۔ مولوی صاحب کا اثر و رسوخ بمبئی میں کافی تھا اور حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ انھوں نے اپنے تمام احباب سے مجھے ملا دیا۔ ان کی اس بے

لوث ہمدردی سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا۔ مولوی محمد علی صاحب نے مجھے کہا تھا کہ میں سیاست سے علیحدہ رہوں۔ اس وقت کانگریس خلاف قانون تھی۔ لیکن بقول جامی۔ "عشق و مشک رانتواں نہفتن" بھلا میں اپنی کانگریسیت کو کیوں کر چھپا سکتا تھا۔ ایک عرصے تک تو میں مولوی صاحب کے مشورے پر عمل پیرا رہا، لیکن رفتہ رفتہ راز فاش ہو گیا اور کانگریسیوں کی آمد و رفت میرے یہاں شروع ہونے لگی۔

من نہ آں رندم کہ ترک شاہد و ساغر کنم
محتسب داند کہ من ایں کارہاکم تر کنم

بمبئی کارپوریشن میں ضلع منٹگمری پنجاب کے ایک جواں سال سکھ کنٹریکٹر تھے، ان کا نام گلاب سنگھ تھا۔ ان کے ماموں پولیس کمشنر کے دفتر میں کلرک تھے۔ ان کے ذریعے سے اکثر پولیس کے ارادوں کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔ گلاب سنگھ پکے کانگریسی تھے۔ کبھی وہ میرے یہاں آتے اور کبھی میں ان کے یہاں جاتا تھا۔ بڑے مخلص انسان تھے۔ ۴ر مارچ ۱۹۳۳ء کو بوقت گیارہ بجے شب وہ میرے گھر پہنچے اور علیحدہ لے جاکر کہا کہ ابھی دس بجے ماموں میرے یہاں آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ تمہارے دوست حکیم فضل الرحمٰن سواتی کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا ہے۔ صرف کمشنر کے دستخط نہیں ہوئے۔ میں نے دیر لگائی ہے۔ کل دستخط ہو جائیں گے تو انھیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹ ہے کہ کانگریسیوں کا ہجوم ان کے یہاں رہتا ہے اور ان کے گھر کانگریس بلیٹن لکھا جاتا ہے۔ چونکہ آرڈیننس کی رو سے تمام اختیارات کمشنر کے ہاتھ میں ہیں، لہذا گرفتاری کے بعد یا تو ان سے، ضمانت طلب کی جائے گی اور یا وہ ایک سال کے لیے جیل بھیج دیے جائیں گے۔ اگر ضمانت

دینے پر آمادہ ہیں تو کوئی اندیشہ نہیں ہے ورنہ قید کر دیے جائیں گے .....
میں نے گلاب سنگھ سے کہا کہ آپ کے ماموں کا شکریہ ،انھوں نے
بروقت مطلع فرمایا۔ ضمانت کے متعلق یہ شعر پڑھا۔

من و رند و عاشق آں گاہ توبہ   استغفر اللہ ، استغفر اللہ

گلاب سنگھ نے کہا خوب سوچ لو، پھر فیصلہ کر لو، وقت کافی ہے۔ کل تین
بجے تک کوئی فیصلہ کر سکتے ہو۔ چنانچہ میں رات بھر سوچتا رہا۔ چونکہ جیل
جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ صحت ٹھیک نہ تھی اور ضمانت بھی نہیں دینا چاہتا
تھا، اس لیے علی الصباح ناسک روانہ ہوا اور وہاں سے رات کے میل سے
دہلی چلا گیا۔ ایک دو دن وہاں قیام کر کے پشاور پہنچا اور کچھ دنوں کے بعد
اپنے وطن مالوف سوات چلا گیا اور ۱۵ اگست ۱۹۳۷ء تک وہاں رہا۔
اس اثنا میں بمبئی کے کانگریسی لیڈر مسٹر نریمان کے متعلق جو پارسی
مذہب سے تعلق رکھتے تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں
جب کانگریس نے وزارت لینے کا فیصلہ کیا تو مجھے دو آدمیوں کے بارے
میں بڑی فکر تھی، ایک تھے جناب یعقوب حسن سیٹھ آف مدراس اور
دوسرے تھے مسٹر نریمان ۔یعقوب حسن تو وزیر بن گئے، لیکن نریمان
صاحب کی بجائے ایک ایسے شخص کو بمبئی کا وزیر اعظم بنا دیا گیا جو تھرڈ
کلاس کانگریسی لیڈر تھا۔ اس پر میں نے ڈاکٹر گور کو خط لکھا، اور یہ میرا پہلا
خط تھا جو میں نے بمبئی کے کسی شخص کو لکھا۔ چونکہ میرا اشمار مفرورین میں
ہوتا تھا، اس لیے میں نے بمبئی کے کسی صاحب کے ساتھ کوئی خط و کتابت
نہیں کی۔ کانگریسی وزارت وہاں قائم ہوئی تو خوف نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر گور
نے فوراً جواب دیا کہ نریمان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ اب انھوں
نے کانگریسی ہائی کمان میں استغاثہ دائر کیا ہے..... انھوں نے مجھ کو

مخاطب کر کے لکھا کہ تم اب وہاں کیوں بیٹھے ہو، وزارت کانگریس کی ہے اور تمام قیدی رہا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں ۱۹ر اگست ۷ ۱۹۳ء کو بمبئی پہنچا اور ڈاکٹر گور کی معیت میں مسٹر نریمان سے ملا۔ مسٹر نریمان کو اب کی دفعہ میں نے خوش و خرم نہیں پایا، افسردہ خاطر تھے۔ ہائی کمان میں بھی ان کا استغاثہ نامنظور ہو گیا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا: مولانا آزاد نے آپ کی حمایت نہیں کی؟ جواب دیا: حمایت کی اور بہت زوردار طریقے سے کی، مگر مولانا کی وہاں کیا چل سکتی تھی۔ معاملہ مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں ہے اور مہاتما جی سردار پٹیل کی گرفت میں ہیں۔ وہ بھی گجراتی ہیں اور یہ بھی گجراتی۔ ہائی کمان میں تین آدمیوں نے میری حمایت کی ہے، مولانا آزاد، جواہر لال اور ڈاکٹر پٹابی سیتا رامیہ نے۔ باقی ممبروں نے سردار پٹیل کا ساتھ دیا۔

مسٹر نریمان نے کہا مجھے اس کا رنج نہیں کہ میں وزیر اعظم نہیں بنایا گیا، اگرچہ میرا حق تھا۔ رنج اس بات کا ہے کہ یناریٹیوں کا اعتماد مجارٹی پر نہیں رہا۔ پنجاب میں سکھ میری مثال پیش کر رہے ہیں اور تین چار دن پیشتر مسٹر جناح نے احمد آباد میں جو تقریر کی ہے، اس میں بھی میرے معاملے کی طرف اشارے کیے ہیں کہ نریمان کو اس لیے وزارت سے محروم کر دیا گیا کہ وہ پارسی تھے، اگر ہندو ہوتے تو یہ بات نہ ہوتی، بمبئی کے وزیر اعظم نریمان ہوتے نہ کہ کھیر ..... انھوں نے کہا کہ اس قسم کی غلطیوں سے مخالفوں کو تقویت پہنچتی ہے اور کانگریس کا وقار کم ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے نریمان سے کہا کہ مولانا آزاد بھی تو مسلمان ہیں اور اقلیت طبقے کے نمائندے ہیں۔ انھیں کیوں ہائی کمان میں رکھا گیا ہے؟

مسٹر نریمان نے جواب دیا کہ مولانا وہاں اقلیت کے نمائندے کی حیثیت

سے نہیں ہیں، بلکہ اس حیثیت سے ہیں کہ مولانا بہت بڑے مدبر اور
صاحب فہم و عقل ہیں۔ ہائی کمان کی گاڑی مولانا کے تازیانے کے بغیر چل
نہیں سکتی۔ جب کسی مسئلے میں الجھاؤ زیادہ پیدا ہو جاتا ہے اور بحث مباحثہ
طوالت اختیار کرلیتا ہے اور تمام ممبر پریشانی کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں
تو مولانا آزاد ہی اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتے ہیں۔ یعنی ہائی کمان کے
صحیح معنوں میں رہنما مولانا آزاد ہیں۔ مولانا کے بغیر ہائی کمان کا ٹٹو چل
نہیں سکتا۔ یہ مولانا ہی کا دماغ ہے جو نہایت پیچیدہ مسائل کو حل کر سکتا
ہے۔ نازک مواقع پر سب ارکان مولانا کے محتاج ہوتے ہیں۔

(پیام مشرق۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۵۹ء)

اس اقتباس کا مطالعہ کرنے کے بعد اب پھر دور ماضی میں چلیے۔ . . . ۱۹۲۷ء کی بات ہے کہ حکیم فضل الرحمن صاحب پٹیالہ جا رہے تھے۔ دہلی کے اسٹیشن پر چند پٹھان ان کے ڈبے میں آکر بیٹھے۔ ان سے بات چیت ہوئی تو پتا چلا کہ ان میں سے ایک شخص مولوی دین محمد قندھاری کے شاگرد ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں مولوی صاحب نے وفات پائی تو اس کے بعد وہ دہلی آگئے اور اب مسجد فتح پوری کے مدرسے میں داخل ہیں اور درجہ آخر میں تعلیم پا رہے ہیں۔

حکیم صاحب نے مولوی دین محمد قندھاری کے اس شاگرد سے پوچھا کہ ۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحنان نعمانی سے معلوم ہوا تھا کہ مولوی دین محمد قندھاری نے مولانا ابوالکلام آزاد کے قائم کردہ "دارالارشاد" میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا. . . .

شاگرد نے کہا یہ صحیح ہے کہ وہ "دارالارشاد" میں داخل ہونا چاہتے تھے، لیکن جنگ عمومی کی وجہ سے انھیں راہ داری کا پروانہ نہیں مل رہا تھا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد یہ پابندی اٹھ گئی اور وہ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچے اور پھر وہاں کے تین ہم وطن سوداگر مل گئے جن میں سے ایک بیمار تھا اور وہ اپنے علاج کے لیے دہلی جا رہا تھا۔ مولوی صاحب کا مقصد معلوم کر کے ان تینوں نے کوئٹہ سے آگرہ تک کا ٹکٹ ان کے لیے بھی خرید لیا۔ دوران سفر میں

مولوی صاحب نے بیمار سوداگر کی بڑی خدمت کی اور اس طرح انھوں نے اس احسان کا بدلہ ادا کیا۔ اس وقت مولانا آزاد چوں کہ کلکتہ سے خارج البلد ہو چکے تھے اور رانچی میں نظر بند کر دیے گئے تھے، اس لیے مولوی دین محمد قندھاری آگرہ سے رانچی پہنچے۔ چند دن وہاں مقیم رہے اور پھر وہاں سے روانہ ہو گئے۔..... جیسا کہ مولانا آزاد نے اپنے انتساب میں ظاہر فرمایا ہے۔

جب ۱۹۳۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر چھپی تو ایک مدت تک حکیم فضل الرحمٰن صاحب کو اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جب انھوں نے ۱۹۳۸ء میں یہ تفسیر دیکھی تو فوراً ان کے ذہن میں یہ بات آئی اور خیال کیا کہ جس شخص کی طرف اس کا انتساب کیا گیا ہے، وہ مولوی دین محمد قندھاری ہیں۔ مگر اس ضمن میں ان کو براہ راست مولانا ابوالکلام آزاد سے رجوع کرنے کا موقع نہیں ملا۔

کانگریس نے صوبائی وزارتیں چھوڑ کر پھر سے انگریزی حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی۔ تمام رہنما جیلوں میں چلے گئے تھے۔ مولانا آزاد کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان حالات میں اس مسئلے کی تحقیق کرنا مشکل امر تھا اور مولانا سے دریافت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہونے کے بعد تمام کانگریسی رہا ہوئے اور اکتوبر کے مہینے میں کانگریس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جس کی صدارت حضرت مولانا آزاد کے سپرد تھی، اس وقت حکیم فضل الرحمٰن صاحب آمبور میں تھے۔ آمبور ہی سے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی گئے تھے۔ اور اپنے ایک دوست میرزا خاں صاحب کے مکان پر قیام فرما ہوئے۔

اجلاس سے ایک دن پہلے وہ حضرت مولانا سے ملنے کے لیے بھولا بھائی ڈیسائی کے بنگلے میں پہنچے، جہاں مولانا فروکش تھے۔ مولانا کے سکریٹری پروفیسر اجمل خاں سے ملاقات ہوئی اور مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اجمل خان صاحب نے صاف کہہ دیا کہ مولانا اس وقت بہت مصروف ہیں، کسی سے مل نہیں سکتے۔ اجلاس ختم ہو جانے کے بعد آ کر ملو۔

یہ الفاظ سن کر حکیم فضل الرحمٰن صاحب اور میرزا خاں صاحب جو حکیم صاحب

کے میزبان تھے، واپس لوٹے اور موٹر میں بیٹھ گئے... موٹر کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہا تھا۔ مشین کی دیکھ بھال میں کچھ وقت صرف ہو گیا... اتنے میں دیکھا کہ بنگلے سے ایک کار نکلی، جس میں چند افراد کے ساتھ اجمل خاں صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ میرزا صاحب نے حکیم صاحب سے کہا اب بہت اچھا موقع ہے، مانع چلا گیا ہے۔ آیئے ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کر لیں۔

بنگلے میں گئے تو بھولا ڈیسائی کے صاحب زادے دھیر دسے ملاقات ہوئی۔

انھوں نے پوچھا: مولانا آزاد سے ملنے آئے ہیں؟

جواب دیا: جی ہاں۔

پوچھا: پہلے سے ملاقات ہے؟

بتایا: جی ہاں۔

کہا: اپنا وزیٹنگ کارڈ دیجیے۔

حکیم صاحب نے کہا: وزیٹنگ کارڈ تو نہیں ہے۔

دھیرو نے ایک سلپ دے کر کہا: اس پر اپنا نام اور پتا لکھ دیجیے۔

حکیم صاحب نے اس پر انوری کا حسب ذیل قطعہ لکھ کر اس کے نیچے اپنا نام لکھا۔

اے خداوندے کہ از ایام اگر خواہی بیابی — جز نظر خویش دیگر ہر جہت از خاطر بیاید

کمتریں بند گانت انوری بر در ستادہ — چوں حوادث باز گرد دیا چو اقبال اندر آید

العبد المذنب حکیم فضل الرحمٰن سواتی۔ خدائی خدمت گار والنٹیر یہ سلپ اندر لے کر گیا۔ پھر فوراً ہی پلٹ آیا اور کہا: چلیے مولانا آپ کو بلا رہے ہیں۔

دھیر و حیران رہ گئے کہ اس قدر جلد باریابی کیسے حاصل ہو گئی۔

مولانا نے حکیم صاحب کو دیکھتے ہی فرمایا: کیا آپ کے پاس انوری کا کلیات ہے؟

حکیم صاحب نے جواب دیا: انوری کا کلیات نہیں ہے مگر مجھے یہ قطعہ شیرانی کے ایک مضمون میں ملا تھا۔

مولانا نے فرمایا: کون شیرانی؟ وہی تو نہیں جنھوں نے مولانا شبلی کا تعاقب کیا ہے؟

حکیم صاحب نے کہا: ہاں وہی پروفیسر محمود شیرانی۔

مولانا نے فرمایا: بہت زیادہ تعاقب کیا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

چوں کہ مولانا بہت مصروف نظر آرہے تھے، اس لیے فوراً حکیم صاحب نے گفتگو کا موضوع بدلا اور کہا: مولانا! آپ نے اپنی تفسیر کا جس شخص کی طرف انتساب کیا ہے، وہ مولوی دین محمد قندھاری ہیں.... پھر اس کی توضیح کرتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا کہ ۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحنان سے افغانستان میں معلوم ہوا تھا کہ مولوی دین محمد قندھاری آپ کے قائم کیے ہوئے "دارالارشاد" میں شریک ہونا چاہتے تھے، مگر چند روز بعد ہی معلوم ہوا کہ آپ کلکتے سے خارج البلد کر دیے گئے ہیں اور رانچی میں نظر بند ہیں۔ مولوی دین محمد قندھاری کے ایک شاگرد سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب قندھار سے پیدل کوئٹہ پہنچے اور پھر ان کے تین ہم وطن سوداگر انھیں کوئٹہ سے آگرہ لے آئے۔ وہاں سے وہ آپ کی خدمت میں پہنچے۔ کچھ دن آپ کے پاس رہے، پھر وہاں سے روانہ ہو گئے، جیسا کہ آپ نے انتساب میں فرمایا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مولوی دین محمد قندھاری کا انتقال ہو گیا اور وہ آپ کی تفسیر نہ دیکھ سکے۔

یہ سن کر مولانا سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا! علامات تو بالکل ٹھیک ہیں۔

حکیم صاحب نے کہا: ان کی سب سے بڑی علامت ان کا کمبل ہے، جس کا آپ نے بھی ذکر فرمایا ہے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ کمبل کے عادی تھے۔ کبھی اپنے ساتھ بستر نہیں رکھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا اور تکیہ سب کچھ کمبل ہی تھا۔ اسی وجہ سے طلبا نے ان کو "شڑے قندھاری" کا لقب دیا تھا، کیوں کہ "شڑے" پشتو میں کمبل کو کہتے ہیں۔

اس پر مولانا آزاد نے فرمایا: واقعی سادہ مزاج بزرگ تھے۔ علمی استعداد بہت اچھی تھی۔ تمام علوم پر اچھا عبور حاصل تھا۔ پہلے پہل جب معلوم ہوا کہ یہ متبحر عالم ہیں تو میں سمجھا شاید معترض بن کر آئے ہیں، مگر دو ایک دن میں معلوم ہو گیا کہ معترض نہیں

بلکہ استفادے کی غرض سے آئے ہیں۔ان کے علمی ذوق اور اس راہ میں طلب صادق اور جستجو سے میں بہت متاثر ہوا۔ تاریخ میں ایسی مثالیں تو بہ کثرت ملتی ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ایک مسئلے اور حدیث کی چھان بین کے لیے بہت دور دراز تک کا سفر کیا، مگر یہ بزرگ اپنی مثال آپ تھے۔۔۔۔ میں نے ان سے نام پوچھا نہ تھا اور نہ انھوں نے بتایا تھا اور اس کے جا۔۔۔ کی کبھی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے ان کے کھانے کا انتظام کر دیا تھا اور رہتے مسجد میں تھے۔ خاص وقتوں میں آتے تھے اور کچھ پوچھ کر چلے جاتے تھے۔ اچانک وہ غائب ہو گئے اور پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

حکیم صاحب نے مولانا سے کہا: اب جب کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے اور مولوی دین محمد قندھاری بھی زندہ نہیں رہے تو ان کے نام کی تصریح کر دینے میں کیا حرج ہے؟

مولانا نے فرمایا: ابہام تصریح سے اچھا ہے" الابهام افصح من التصريح " مشہور مقولہ آپ نے بھی سنا ہوگا۔

حکیم صاحب کی اس سے تشفی ہو گئی اور وہ اجازت لے کر چلے آئے۔ چونکہ مولانا آزاد نے تصریح نہیں چاہی اس لیے پھر اس واقعے کی طرف حکیم صاحب کا خیال بھی نہیں گیا۔ پھر جب ڈاکٹر محمد یوسف کوکن کی عظیم الشان تالیف "امام ابن تیمیہ" شائع ہوئی تو حکیم صاحب کے پرانے جذبات میں ایک زبردست طوفان پیدا ہو گیا اور انھوں نے باقصد وارادہ اس واقعہ کا اپنے نجی خط میں تذکرہ کر دیا۔ اور جب ڈاکٹر کوکن صاحب کے اصرار کی وجہ سے یہ خط چھپ گیا تو اس واقعہ کے متعلق مزید وضاحت بھی کرنی پڑی۔

مضمون نگار مولانا حکیم عزیز الرحمٰن عمری اعظمی فرماتے ہیں۔

میں خاص طور پر حکیم صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس واقعہ سے متعلق مزید تفصیلات بیان کرنے کی اجازت دی۔

آزادی کے بعد اگرچہ حکیم صاحب گوشہ نشیں ہو گئے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ہمارا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا، یعنی بدیسی حکومت کا خاتمہ اور دیسی حکومت کا قیام۔۔۔ اب مجھے

مزید جستجو کی ضرورت نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کی ذات اس زمانے کے مغتنمات میں سے تھی۔۔۔ اگر کوئی شخص ان کی پرانی زندگی کے واقعات کے متعلق گفتگو چھیڑ کر تمام واقعات قلم بند کرتا تو برصغیر کے سرفروشوں اور جاں بازوں کی ایک حیرت انگیز اور دلچسپ تاریخ مرتب ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔

تقسیم ملک سے پہلے حکیم صاحب کبھی کبھی اپنے وطن (صوبہ سرحد) جاتے اور سرخ پوش تحریک میں شامل رہتے، لیکن پاکستان بننے کے بعد نہیں گئے اور وہیں رہ گئے۔ اگرچہ ان کے تمام اقربا پاکستان میں ہیں۔ بیٹی جو یہاں پیدا ہوئی تھی، وہ تھانہ سوات میں ہے۔ ان سب کا اصرار تھا کہ پاکستان آجاؤ مگر حکیم صاحب جانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ البتہ یہ کہتے رہے کہ پاکستان کی ترقی کا دل سے خواہاں ہوں۔۔۔۔"

مضمون کے مندرجات یہاں ختم ہوئے۔۔۔۔۔ فاضل مضمون نگار مولانا حکیم عزیز الرحمٰن عمری نے یہ مضمون ۱۹۶۰ء میں تحریر فرمایا تھا، اس وقت تک حکیم فضل الرحمٰن سواتی پاکستان نہیں تشریف لائے ہوں گے، لیکن ۱۹۶۳ء کے آخر میں وہ پاکستان میں تھے اور بہت سے حضرات سے ملے تھے، جن میں مولانا سید محمد داوٗد غزنوی، مولانا غلام رسول مہر اور مولانا محی الدین احمد قصوری شامل ہیں۔۔۔۔ اس فقیر کو اسی زمانے میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ بڑے خوش مزاج اور شگفتہ کلام بزرگ تھے۔ غالباً دوبارہ ہندوستان نہیں گئے، پاکستان ہی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ مولانا داوٗد غزنوی کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے مسکن تھانہ (سوات) سے "الاعتصام" میں اشاعت کے لیے میرے نام ایک مضمون ارسال فرمایا تھا، جس کا عنوان تھا "حضرت مولانا سید داوٗد غزنوی" یہ مضمون بھی پہلے مضمون کی طرح بہت سی پرانی سیاسی معلومات پر مشتمل ہے اور اس میں نہایت عقیدت کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، اس لیے یہ مضمون بھی یہاں شائع کیا جارہا ہے تاکہ اس کتاب میں بھی محفوظ ہو جائے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حکیم فضل الرحمٰن

صاحب کا انتقال کب ہوا۔ اب ان کے مضمون کا مطالعہ فرمایئے۔

''مولانا داؤد غزنوی ایک جید عالم دین اور تحریک آزادی ملک کے سر بر آوردہ علم بردار تھے۔ اس سلسلے میں انگریزی حکمرانوں نے ان کو کم و بیش دس بار جیل بھیجا۔ ۱۹۱۹ء میں امر تسر جلیان والا باغ کے حادثہ فاجعہ کے نتیجے میں جو مارشل لا نافذ ہوا اس میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے ساتھ مولانا غزنوی کو بھی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس امر تسر میں منعقد ہوئے تھے۔ لیگ کے صدر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں تھے اور کانگریس کے صدر موتی لال نہرو۔۔۔۔۔ اس موقع پر گورنمنٹ نے تمام سیاسی نظر بندوں اور قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ چھندواڑہ سے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی رہا ہو کر امر تسر تشریف لے گئے تھے۔ پہلے تو یہ دونوں بھائی کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور تقریریں کیں، پھر لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ رات کا وقت تھا۔ جناب ڈاکٹر اقبال نے ان دونوں کے خیر مقدم میں مندرجہ ذیل اشعار سنائے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند   قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک از فر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے   مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر   کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
''شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست   ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند''

یہ اشعار پڑھنے سے تمام مجمعے پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے سامنے ایک خوش شکل نوجوان بیٹھے تھے، وہ داد دینے میں سب سے آگے تھے اور ہر شعر پر زور سے پکار پکار کر کہتے تھے ''مکرر کہیے۔'' یہ سن کر ڈاکٹر صاحب پھر اسے دہراتے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا: یہ جوان کون ہیں؟ انھوں نے کہا کہ سید داؤد غزنوی ہیں۔ میں نے کہا وہی داؤد غزنوی جو مارشل لا کی گرفت میں آئے تھے؟ انھوں نے کہا ہاں وہی داؤد غزنوی۔ کل ہی رہا ہوئے ہیں۔ اجلاس کے اختتام پر میں ان سے ملا اور رہائی پر مبارک باد دی۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی جو مولانا سید داؤد غزنوی سے ہوئی تھی۔

ایک مہینے کے بعد بمبئی میں خلافت کانفرنس زیر صدارت غلام محمد بھرگری منعقد ہوئی۔ حضرت مولانا آزاد بھی اس میں شریک تھے۔ اور مولانا سید داؤد غزنوی مع چند ہمراہیوں کے امرتسر سے آکر شریک ہوئے تھے۔ مظفر آباد ہال میں جس میں کانفرنس کی سبجیکٹ کمیٹی کے اجلاس ہوا کرتے تھے، تمام ڈیلی گیٹ اقامت پذیر تھے۔ مولانا غزنوی ؒ بھی اس میں مقیم تھے اور راقم الحروف بھی اسی ہال میں اقامت گزیں تھا۔ رات اور دن ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ دس دن تک ہم ساتھ رہے۔ ان کو حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے کمال عقیدت مندی تھی اور مولانا آزاد کا بھی زیادہ رجحان مولانا سید داؤد غزنویؒ کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

کانفرنس کے اجلاسوں میں مولانا آزاد نے کوئی تقریر نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ماہ قبل مولانا محمد علی جوہر خلافت کے نمائندے بن کر لندن تشریف لے گئے تھے، تاکہ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ سے درخواست کر کے ملاقات کریں اور خلافت کا مسئلہ انھیں سمجھائیں۔ لیکن مولانا آزاد کو اس قسم کی وفد بازیوں اور درخواستوں سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خدا پر اعتماد کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو کامیابی کا ذریعہ بنا دینا چاہیے۔ مولانا شوکت علی صاحبؒ اور دوسرے متعدد لیڈروں نے مولانا آزادؒ سے درخواست کی کہ آپ کوئی موثر تقریر فرمائیں، لیکن مولانا آزادؒ تقریر کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ تمام ڈیلیکیٹ اور خاص کر پنجابی نمائندے مولانا آزاد کی تقریر سننے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ امرتسر والے ڈیلیکیٹوں نے مولانا غزنویؒ سے کہا کہ آپ ہی مولانا آزاد سے کہیے کہ تقریر فرمائیں۔ چنانچہ مولانا غزنوی صاحبؒ نے میرے سامنے مولانا آزاد سے کہا کہ لوگ آپ کی تقریر سننے کی بہت خواہش رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد نے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں تو ضرور آج رات کو عام اجلاس میں تقریر کروں گا۔ چنانچہ رات کے ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک مولانا آزاد نے پر حقائق اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ مسئلہ خلافت کی اہمیت اور وضاحت بڑی عمدگی کے ساتھ کی۔ مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافی کی قلعی کھول دی

اور صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فرمایا کہ لائیڈ جارج کی یہ وعدہ خلافی آزادی ہند کا پیش خیمہ ہے۔ انگریزی حکومت سے دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک تو اس کے وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافی جو ترکی حکومت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری غلطی ہے جلیاں والا باغ کی گولہ باری ...... پہلی غلطی سے وہ مسلمانان ہند بھی جو انگریزی حکومت کے وفادار تھے، سخت برافروختہ ہو گئے ہیں اور دوسری سے تمام باشندگان ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک گئے ہیں۔ ع:

خدا شرے برانگیزد کہ خیرے مادراں باشد

مولانا آزادؒ کی اس پر مغز تقریر سے تمام حاضرین بہت متاثر ہوئے اختتام جلسہ پر لوگ مولانا سید داؤد غزنویؒ کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ ان کے کہنے سے مولانا آزادؒ نے تقریر فرمائی، ورنہ وہ تقریر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

تین مہینے کے بعد مدراس میں خلافت کانفرنس زیر صدارت مولانا شوکت علی منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر میں نے مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کو خط لکھا کہ کانفرنس میں آکر شریک ہو جایئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں ابھی مولانا آزادؒ سے مل کر دہلی سے آیا ہوں۔ مولانا آزاد کا ارادہ مدراس کانفرنس میں شرکت کا نہیں ہے، اس لیے میں شریک نہیں ہوں گا۔

تین ماہ کے بعد کلکتہ میں کانگریس کا اسپیشل اجلاس زیر صدارت لالہ لاجپت رائے منعقد ہوا۔ اس میں مولانا سید داؤد غزنویؒ شریک تھے۔ میں بھی شریک ہوا۔ چار دن ہم برابر ملتے رہے۔

چار مہینے کے بعد ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس زیر صدارت وجے راگو اچاریہ منعقد ہوا۔ اس موقعے پر پھر مولانا سید داؤد غزنویؒ چند ہم راہیوں کے ساتھ شریک اجلاس تھے۔ میں بھی شریک تھا۔ کانگریس کیمپ میں ہم سب ایک ہی جگہ قیام پذیر تھے۔ مہاتما گاندھی آنجہانی کی نان کو آپریشن (ترک موالات) والی تحریک اس اجلاس میں بالاتفاق پاس ہوئی۔ صرف ہندوؤں میں سے مدن موہن مالویہ نے اور مسلمانوں میں

سے مسٹر محمد علی جناح نے مخالفت کی تھی۔ یہ دونوں کانگریس سے نکل گئے۔ جناح صاحب تو آخیر عمر تک پھر کانگریس میں شریک نہیں ہوئے لیکن مالویہ جی ۱۹۲۷ء میں جو مدراس میں کانگریس کا اجلاس زیر صدارت جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا تھا، اس میں آکر شریک ہوئے۔

ناگپور کانفرنس میں مولانا سید داؤد غزنویؒ سے دس دن تک مجھے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اس وقت ایک عجیب و غریب مذہبی واقعہ بھی پیش آیا۔ کانگریس کیمپ میں چند مسلمانوں نے مغرب کی نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اقامت میں نے کہی اور امامت مولانا غزنویؒ نے کی۔ نماز میں وہ اپنے مسلک کے مطابق باقاعدہ رفع یدین کرتے رہے۔ میرے ساتھ ایک حیدر آبادی صاحب کھڑے تھے، سلام پھیرتے ہی انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہماری یہ نماز صحیح ادا ہوئی ہے؟ میں نے کہا ہاں: صحیح ہے۔ انھوں نے کہا کہ امام تو وہابی ہیں، وہابی کے پیچھے حنفیوں کی نماز درست نہیں ہے۔

مولانا داؤدؒ نے کہا:

"میں وہابی نہیں ہوں بلکہ اہل حدیث ہوں۔ حنفی مذہب میں اور اہل حدیث میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی تو اہل حدیث تھے۔"

اس شخص کو بہت غصہ آیا۔ مولانا نے فرمایا کہ سنو بھائی امام اعظم کا یہ قول ہے: "اذاصح الحدیث فھو مذھبی" اس قول کی مولانا نے اچھی طرح تشریح فرمائی۔ تمام نمازیوں نے مولانا غزنویؒ کا نظریہ قبول کیا اور وہ شخص بھی قائل ہو گیا۔ مولانا کی تشریح و توضیح سے لوگوں کے دلوں میں غیر مقلدین کے خلاف جو شکوک تھے، وہ سب رفع ہو گئے۔

گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کے پاس ہونے کے بعد پبلک میں حکومت کے خلاف جذبات برانگیختہ ہو گئے اور سخت و تیز تقریریں ہونے لگیں۔ لوگوں میں بہت جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ گورنمنٹ بھی سختی پر اتر آئی اور گرفتاریاں شروع کر دیں۔ بالخصوص کراچی میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا

نثار احمد صاحب کی سزایابی سے مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک خاتون کی ایک نظم روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع ہوئی جس کے ایک دو شعر جو اس وقت نوک زبان تھے سنئے:

جو کچھ پڑے گی مجھ پہ مصیبت اٹھاؤں گی　　خدمت کروں گی ملک کی اور جیل جاؤں گی

جا کر کراچی جیل میں کوٹوں گی رام باس　　شوکت علی کے ساتھ میں چکی چلاؤں گی

مہاتما جی بھی بڑودہ جیل بھیج دیے گئے۔ میں بھی جیل چلا گیا۔ میری گرفتاری سے ایک ہفتہ قبل مولانا سید داؤد غزنویؒ بھی جیل جا چکے تھے۔ رہائی کے بعد ۱۹۲۴ء میں کاکناڈا میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ خلافت کانفرنس کے صدر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے اور کانگریس کے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ اس موقع پر مولانا سید داؤد غزنویؒ بھی مع چند ساتھیوں کے شریک اجلاس تھے۔ میں بھی شریک تھا اور کانگریس کیمپ میں ان کے ساتھ مقیم تھا اور ہر وقت تبادلہ خیالات ہو تا رہتا تھا۔ خلافت کانفرنس میں میرا ایک رزولیوشن عدن کے بارے میں، جس کا اعلان پہلے اخبارات میں شائع ہو چکا تھا، پیش ہونے والا تھا۔ مولانا داؤدؒ نے نجی طور پر مجھ سے کہا کہ تم میری ترمیم قبول کر لو تو پھر میں تمہارے رزولیوشن کی تائید کروں گا۔ چونکہ ترمیم رزولیوشن کے منافی نہیں تھی، اس لیے میں نے بطیب خاطر قبول کر لی، پھر عام جلسے میں مولانا غزنویؒ نے بڑے عمدہ پیرایہ میں میری تحریک کی تائید فرمائی، جس سے میری شخصیت بہت نمایاں ہو گئی۔

اخبار ''وکیل'' امرتسر نے مولانا داؤد غزنویؒ پر ایک دفعہ سخت تنقید کی تھی اور لکھا تھا کہ یہ سکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں جس سے قوم کا پیسہ برباد ہو جاتا ہے۔ میں نے اس بارے میں ان سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں کبھی دور دراز کا سفر کرتا ہوں تو سکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھتا ہوں، عیش و آرام کی خاطر نہیں بلکہ نماز کی خاطر.... اب جو آیا ہوں تو سکنڈ کلاس میں آیا ہوں اور جاؤں گا بھی سیکنڈ کلاس میں (انشاء اللہ تعالیٰ)۔ سکنڈ کلاس کے ڈبے میں اطمینان سے نماز کا موقع ملتا ہے، تھرڈ کلاس میں

اطمینان سے نماز کا موقع نہیں ملتا۔ میں اپنے پیسے سے سفر کرتا ہوں۔ خلافت کمیٹی کا اگرچہ میں صدر ہوں، لیکن کمیٹی کی رقم میں نے ذاتی مفاد میں کبھی خرچ نہیں کی ہے۔ اخبار "وکیل" امرتسر نے سمرنافنڈ کی تمام رقوم خورد برد کردی ہیں، اس لیے وہ بفحوائے "من رافی نفسه فقد رافی غیرہ" دوسروں پر بدگمانی کرتا ہے۔ اخیر میں حافظ کا یہ شعر سنایا:

بیا کہ خرقہ من گرچہ وقف میکدہ ہاست   زمال وقف نہ بینی بنام من درمے

کاکناڈا کانفرنس کے بعد خلافت کا مسئلہ بہت سست پڑ گیا تھا، کیونکہ مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ہندوستان میں اب صرف کانگریس کی تحریک چلتی تھی، جب کبھی کانگریس کے اجلاس ہوتے تھے اور میں بھی شریک ہوتا تو مولانا داؤد غزنویؒ سے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ تو باقاعدہ ہر اجلاس میں شریک ہوتے تھے اور میں کبھی کبھار شریک ہوتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں جامعہ دارالسلام عمر آباد کی دستار بندی کے جلسے میں وہ عمر آباد تشریف لائے۔ اس موقعے پر بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر کوئی موقع ملاقات کا نہیں ملا۔ اب حال میں جب میں مغربی پاکستان گیا تو ۳/دسمبر ۱۹۶۳ء کو ان سے شرف ملاقات کا موقع ملا۔ یکم دسمبر کو میں لاہور پہنچا اور مولانا غلام رسول مہر صاحب کے خوشنما بنگلے واقع مسلم ٹاؤن میں قیام پذیر رہا۔ پھر حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ سے ملنے کے لیے روانہ ہوا۔ پہلے مولانا محی الدین احمد قصوری سے جا کر ملا، پھر ان سے کہا کہ میں مولانا سید داؤد غزنوی سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا وہ ہسپتال میں ہیں، میں بھی ان سے ملنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ چنانچہ ہم دونوں ہسپتال گئے۔ میں نے نبض دیکھ کر کہا کہ خدا کے فضل سے بیماری تو نہیں ہے، البتہ نقاہت بہت ہے۔ مولانا نے کہا کہ ڈاکٹر کی بھی یہی رائے ہے اور کہتے ہیں کہ اب گھر چلے جاؤ۔ چنانچہ آج گھر جانے کا قصد ہے۔ میں نے کہا نقاہت کی دوا میرے پاس ہے۔ اسوقت تو تیار نہیں ہے لیکن وطن سوات جا کر بناؤں گا اور ایک کورس آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ انھوں نے فرمایا ضرور بھیجیے، میں ان شاءاللہ تعالیٰ ضرور

استعمال کروں گا۔

میں نے ان کو مولانا ظفر علی خاں کے چند طنزیہ اشعار سنائے جن کو سن کر وہ بہت ہنسے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ تحریک نمک میں جب پولیس نے مولانا کو گرفتار کر لیا، تو وہ پولیس کے ساتھ جاتے نہیں تھے۔ پولیس نے بہ جبر ان کو اٹھا کر موٹر میں بٹھا دیا۔ جب کورٹ پہنچائے گئے تو موٹر سے اترتے نہ تھے، پھر پولیس نے ان کو پکڑ کر جج کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ جب سزا ہوئی تو جیل جاتے نہ تھے، پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر میں بٹھا دیا۔ جیل پہنچے تو اترتے نہ تھے، پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر سے اتارا۔ مولانا ظفر علی خان صاحب بھی جیل میں تھے۔ یہ کشمکش دیکھ کر چند اشعار فی البدیہ موزوں کر دیے۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں:

دی مولوی داؤد کو چڑی جو پولیس نے — احباب نے پوچھا بہ تعجب کہ یہ کیا ہے
کیوں لد کے چلے دوش حکومت پہ حضور آج — حضرت کی سواری کا طریقہ یہ نیا ہے
فرمانے لگے ہنس کے کہ میں عالم دیں ہوں — اور مرتبہ سرکار میں عالم کا بڑا ہے
اس واسطے مرکب کے عوض فرط ادب سے — پیش اپنے تئیں آپ حکومت نے کیا ہے
ہے فخر یہ مجھ کو کہ مری ران کے نیچے — خود حضرت عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہے

پھر مولانا نے جامعہ دار السلام عمر آباد کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ اچھی حالت میں ہے، جب سے مولانا عبد الوہاب صاحب ناظم جامعہ بنے ہیں، جامعہ ترقی پر ہے۔ پھر میں نے جامعہ کے اساتذہ اور دوسرے عملے کی جانب سے کہا کہ سب آپ کی خدمت میں السلام علیکم عرض کر رہے تھے اور آپ کی صحت کے لیے دست بہ دعا رہتے ہیں۔ مولانا شعیب عمری کو جب معلوم ہوا کہ میں پاکستان جا رہا ہوں تو انھوں نے مجھے لکھا کہ میرا ابھی پاکستان جانے کا ارادہ تھا کیونکہ اخبارات کے ذریعے سے مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کی وحشت ناک خبر سمع خراش ہوئی ہے۔ ان سے نیاز حاصل کرنے کا ارادہ تھا، لیکن پاسپورٹ نہیں ملا۔ آپ میری طرف سے سلام کہیے۔ چنانچہ میں

نے مولانا شعیب کی جانب سے خاص طور پر ان کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیا۔ مولانا نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ بنگلور میں سی عبدالحکیم صاحب کے پوتے حاجی صدیق حسن صاحب کے ساتھ مل کر تجارت کر رہے ہیں۔ ان کے نانا مولانا فقیر اللہ صاحبؒ ہیں۔ یہ سنتے ہی مولانا غزنوی فوراً کہنے لگے کہ مولانا فقیر اللہ صاحب میرے والد کے شاگرد تھے میں بچپن سے ان کو جانتا ہوں۔ میری طرف سے بھی محمد شعیب صاحب عمری کو السلام علیکم کہیے گا۔

میں جب سوات پہنچا تو شدت سردی کی وجہ سے سخت علیل ہو گیا، اس لیے دواتیار نہ کر سکا۔ ایک روز میرا نواسہ روزنامہ جنگ کراچی مجھے سنا رہا تھا جس میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے انتقال پر ملال کی خبر سننے میں آئی۔ سن کر بہت متاثر ہوا اور مغفرت کی دعا کی۔"

افسوس ہے یہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ اب (کم از کم جماعت اہل حدیث میں) کوئی ایسا نہیں رہا جو پرانے دور کے اہل علم کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ اور ان کی تگ و تاز کی مختلف نوعیتوں سے باخبر ہو۔ نہ کسی کو اس قسم کی باتوں کا علم ہے، نہ دلچسپی، نہ سننے کا شوق اور نہ پڑھنے کی لگن۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بہت بڑے صاحب علم دوست نواب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی تھے، جن کے نام انھوں نے قلعہ احمد نگر جیل سے وہ خطوط لکھے جو "غبار خاطر" کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ خطوط نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور علمی وادبی اعتبار سے شاہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا ان خطوط میں نواب صاحب شروانی کو "صدیق مکرم" سے خطاب فرماتے ہیں۔ سیاسیات سے ان کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا اور نہ مولانا ان سے کوئی سیاسی بات کرتے تھے۔ انھوں نے اگست ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات پر مولانا محمد حنیف ندوی نے ۲۵ اگست ۱۹۵۰ء (۱۰ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ) کے ہفت روزہ "الاعتصام" میں تعزیتی شذرہ لکھا تھا۔ مولانا آزاد کے تذکرے میں نواب صاحب ممدوح کا تذکرہ بھی آتا ہے، اس مناسبت سے

یہ شذرہ یہاں درج کیا جارہا ہے۔اس کا عنوان ہے "مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب سابق صدر الصدور کا انتقال"......اس عنوان کے تحت مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں۔

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے لازوال خطوط میں جن کو ''صدیق مکرم'' کے نام سے یاد فرمایا ہے،افسوس ہے ان کا انتقال ہو گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔مرحوم میں بڑی خوبیاں تھیں۔ندوۃ العلما(لکھنؤ) کے ایک اجلاس میں ان سے تعارف ہوا۔وضعداری اور اخلاص و سنجیدگی کا پیکر تھے۔تاریخ اسلامی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور دین سے ان کا جو لگاؤ تھا وہ تو بالکل والہانہ قسم کا تھا۔یعنی اس میں عقلیت کی کوئی آلودگی نہیں تھی۔ان کا کتب خانہ نوادر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔بڑے بڑے اہل علم کو تصنیفات کے سلسلے میں ان کے کتب خانے سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔''

''ان کی دو باتیں اب تک کانوں میں گونج رہی ہیں.....

''ایک مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں تشریف لائے اور سید سلیمان ندوی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مولانا! یہ کیا بات ہے کہ ہمارے ہاں فارسی کا ادب رندی و ہوسناکی سے بھرپور ہے۔مگر اس کے باوجود یہ عجیب معاملہ ہے کہ جو لوگ اس کا ذوق رکھتے ہیں،ان میں اسلامیت کی جڑیں بڑی گہری اور بڑی مضبوط ہیں۔

''ایک مرتبہ ہمارے ایک ندوی دوست جو نئے نئے مصر سے آئے تھے، ندوے کے سالانہ جلسے میں تقریر کر رہے تھے اور مجمعے کو یہ باور کرا رہے تھے کہ الحاد و زندقہ کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے اور ہمارے علما اس سے بالکل ناواقف ہیں...اس پر شروانی صاحب مرحوم جلال میں آگئے اور برجستہ فرمایا کہ اسلام کو کسی طوفان کا خطرہ لاحق نہیں....اس نے گزشتہ تاریخ میں اس طرح کے ہر طوفان سے اپنے کو بچایا ہے۔سب سے بڑا طوفان اور

خطرہ وہ مرعوبیت ہے جو ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھا رہی ہے، اور اس کا واقعی کوئی علاج نہیں ہے۔

"مرحوم میں رئیسانہ سج دھج کے ساتھ، ایک طرح کا درویشانہ وقار بھی تھا، جسے دیکھنے والے خواہ مخواہ متاثر ہوتے تھے.....

ان کا وجود ہندوستان میں مغتنمات میں سے تھا... اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، وہ بہت سے اوصاف کے حامل تھے۔"

گزشتہ سطور میں مولانا آزاد سے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ بعض واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اب چند الفاظ ان کے سفر آخرت کے بارے میں پڑھیے۔

۱۵ر فروری ۱۹۵۸ء کو پریڈ گراؤنڈ دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، جس کا افتتاح وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا۔ اس اجلاس میں مولانا آزاد بھی شریک تھے اور انھوں نے تقریر بھی کی تھی۔ ان کی زندگی کی یہ آخری تقریب تھی، جس میں وہ شریک ہوئے اور آخری تقریر تھی جو انھوں نے فرمائی۔

۱۹ر فروری کو وہ معمول کے مطابق علی الصباح اٹھے اور غسل خانے میں گئے۔ غسل خانے ہی میں اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ گر پڑے۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ مسلسل تین دن یہی حالت رہی۔ درمیان میں ایک یا دو مرتبہ ہوش کی کچھ لہر سی آئی تو قریب بیٹھے ہوئے کسی شخص کو پہچانا۔ اسی اثنا میں پنڈت جواہر لال نہرو قریب آئے تو انھیں "خدا حافظ" کہا۔

ایک موقعے پر ڈاکٹروں کے آکسیجن گیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے پنجرے میں کیوں بند کر رکھا ہے۔ بس اللہ پر چھوڑ دو"۔

علاج معالجے کی تمام انسانی کوششیں کی گئیں اور ہر قسم کی تدبیریں آزمائی گئیں، مگر وہی ہوا جو اللہ کو منظور تھا۔

حالت انتہائی خطرناک تھی اور تمام دنیا میں منٹ منٹ کی معالجاتی خبریں پہنچ رہی

تھیں۔پاکستان کے اخبار تین دن کافی تاخیر سے چھپتے رہے کہ معلوم نہیں کسی وقت کسی انہیے کی خبر آجائے۔ آخر ۲۲؍فروری ۱۹۵۸ء (۲؍شعبان ۱۳۷۷ھ) کو جمعے اور ہفتے کی درمیانی رات ہندوستانی وقت کے مطابق دو بج کر دس منٹ پر وہ اپنی سرکاری قیام گاہ (واقع کنگ ایڈورڈ روڈ نئی دہلی) میں تقریباً ستر سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

وفات کی خبر آن واحد میں پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ان کے آخری دیدار کے لیے پاک و ہند کے مختلف گوشوں سے لوگوں نے دہلی پہنچنے کی کوشش کی۔ قریبی مقامات اور گرد و نواح کے علاقوں سے جو لوگ سورج نکلنے تک ان کی جائے وفات پر پہنچ گئے تھے،ان کی تعداد ایک لاکھ سے زائد بتائی گئی تھی۔

ان کی وفات کے سوگ میں حکومت ہند نے پورے ملک میں تعطیل کا اعلان کیا اور سرکاری پرچم سرنگوں کر دیے گئے۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات منسوخ کر دی گئیں۔ حکومت ہند نے ملک بھر میں سات دن تک مولانا کا سوگ منانے کا اعلان کیا۔اس دن حکومت کے ایک غیر معمولی گزٹ میں مولانا کی وفات کی خبر سیہ حاشیے کے ساتھ شائع کی گئی، جس میں ان کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا تھا۔

غسل دینے کے بعد ہفتے کے دن صبح سات بجے ان کی میت کمرے سے باہر لا کر تخت پر لٹا دی گئی تاکہ لوگ ان کا آخری دیدار کر لیں۔سب سے پہلے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد نے میت پر پھول ڈالے۔ میت ایک کشمیری شال اور ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپیٹی گئی تھی۔

پروگرام کے مطابق مولانا کا جنازہ گیارہ بجے اٹھایا جانا تھا، لیکن آخری دیدار کرنے والوں کے بے پناہ ہجوم کے باعث وقت بدلنا پڑا۔ چنانچہ بارہ بج کر دس منٹ پر جنازہ تخت سے اٹھا کر تابوت پر لٹایا گیا اور تابوت ایک توپ گاڑی پر رکھا گیا، جسے پھولوں اور سبز پتوں سے سجایا گیا تھا۔

سوا بارہ بجے جنازہ کا جلوس مولانا کی آخری آرام گاہ سے پریڈ گراؤنڈ کی طرف روانہ ہوا۔ جلوس کے آگے دو پائلٹ تھے اور پیچھے پولیس کی گاڑی تھی۔ اسکے پیچھے پچاس فوجیوں کا ایک دستہ تھا۔ جلوس دو بج کر بیس منٹ پر پریڈ گراؤنڈ میں پہنچا۔ جلوس میں مسلمان، ہندو، سکھ عیسائی، پارسی ہر مذہب کے لوگ شامل تھے اور سب کے چہروں پر حزن وملال کی کیفیت طاری تھی۔

ہندوستانی وقت کے مطابق دو بج کر بیس منٹ پر مولانا کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ حضرت مولانا احمد سعید دہلوی نے پڑھائی۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ لاکھ افراد نے جنازے میں شرکت کی۔

۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو ہفتے کے دن سہ پہر کے وقت تین بجے سے کچھ پہلے جامع مسجد کے قریب آزاد پارک میں امام الہند کی میت قبر میں اتاری گئی۔ سب سے پہلے مولانا احمد سعید نے قبر پر مٹی ڈالی۔ قبر کے قریب ایک قالین رکھ دیا گیا تھا۔

تدفین کے بعد تقریباً ہر جگہ غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ لاہور میں موچی دروازے کے باہر گراؤنڈ میں تین بجے کے قریب کئی ہزار افراد نے امام الہند کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ نماز جنازہ ان کے دیرینہ رفیق حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے پڑھائی۔

اللّٰھم اغفرله و ارحمه و عافه واعف عنه واکرم نزله ووسع مدخله وادخله جنت الفردوس۔

مولانا کی وفات کے بعد بے شمار لوگوں نے بصورت نظم و نثر ان پر لکھا۔ اخبارات ورسائل کے خاص نمبر شائع ہوئے۔ ان کے افکار و تصورات اور علم و عرفان کے بارے میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ابھی ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر لکھا جائے گا اور ان کے فضل وکمال کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے گا، اور اجاگر کرنا چاہیے۔ اب آخر میں ہندوستان کے معروف شاعر وادیب جگن ناتھ آزاد کی ایک نظم شائع کی جارہی ہے جس کا عنوان ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت"

جس کا دھڑکا تھا بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی
وہ خبر آئی کہ بزم زندگی تھرا گئی
روشنی جس کی حریم روح کو چمکا گئی
ظلمت مرگ اس ستارے کو بھی آخر کھا گئی

جس سے روشن اپنے سینے تھے، منور تھے دماغ
بجھ گیا وہ علم کا، حکمت کا، دانش کا چراغ

بجھ گیا، اے زندگی! تیرا چراغ علم و فن
غرق ظلمت ہو گئی علم و ادب کی انجمن
یوں چلا باد خزاں کا ایک جھونکا دفعتہً
رہ گیا مرجھا کے تہذیب و تمدن کا چمن

اب چمن میں اس وضع کا گل نہ کھلنے پائے گا
بو الکلام آزاد کا ثانی نہ ملنے پائے گا

اے وطن! تیرا امیر کارواں جاتا رہا
ناز تھا جس پر، وہ گنج شائگاں جاتا رہا
داستان کیسی کہ زیب داستاں جاتا رہا
اے کلام اللہ! تیرا ترجماں جاتا رہا

جس کی تحریروں سے روشن تھی شب افکار شرق
آج ٹھنڈا ہے وہ سوز سینہ احرار شرق

نطق کا، فن کا، ہنر کا، علم کا عرش عظیم
کشور ہندوستاں میں طور معنی کا کلیم
آبروئے عصر حاضر، نازش دور قدیم
فلسفے کے اور مذہب کے گلستاں کی شمیم

یہ خزانہ زندگی آخر کہاں گم ہو گیا
ظلمتوں میں اک شرار جاوداں گم ہو گیا

بوالکلام اے کاروان علم و حکمت کے امیر
مرشد روشن بصر ،روشن دل و روشن ضمیر
آسمان جذبہ اخلاص کے مہر منیر
تو نے دنیا کو دکھا دی عظمت و شان فقیر

فاش تھی تیری نگاہوں پر نمود زندگی
تیرا ہر نکتہ ضمیر اندر وجود زندگی

علم کی محفل میں گاہے درفشاں ،گاہے خموش
زندگی کے معرکے میں پختہ کار و سخت کوش
اے فقیر خوش کلام و نرم خو و سادہ پوش
ہائے،تو کتنا ادائے فرض میں تھا گرم جوش

تیری نظروں پر عیاں تھا روزگار شرق وغرب
تیری حکمت تھی سراپا راز دار شرق و غرب

کھل اٹھی جب بھی کبھی میرے مقدر کی کلی
خوبی تقدیر تیرے پاس مجھ کو لے چلی(۱)
ناز اوج بخت پر اور ساتھ دل کی بے کلی
فاش تھے باریک تر نکتے بہ عنوان جلی

تازگی حاصل وہ ہوتی تھی تری گفتار سے
روح کو ملتی ہے جو اقبال کے اشعار سے

---

(۱) مجھے مولانا کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

تیرے دم سے تھا سیاست کو بھی حاصل اک وقار
تیری سطوت ملک و دولت کے لیے سنگیں حصار
عصر نو میں، اے دیار فقر و دین کے تاج دار!
تیرے دل کا صدق تھا تیری نظر سے آشکار

جادہ آرا نور قرآنی ترے سینے میں تھا
جوہر خورشید تیرے دل کے آئینے میں تھا

نالہ کش ہیں موت پر تیری ادیبان وطن
گریہ ساماں ہیں سراپا نغمہ سنجان وطن
کچھ خبر بھی ہے تجھے، او عظمت و شان وطن
ہم نے یوں دیکھی نہ تھی صبح پریشان وطن

زندگی جن کے لیے ہے امتحاں تیرے بغیر
اب سنائیں کس کو اپنی داستاں تیرے بغیر

کیا بتائیں ہم، ترے جانے سے کیا جاتا رہا
کشتی علم وادب کا نا خدا جاتا رہا
ہند کے اہل قلم کا آسرا جاتا رہا
تیرے دم سے تھا جو باقی حوصلہ، جاتا رہا

جانے والے! اک ترے جانے سے کیا باقی نہیں
زندگی کی بزم باقی ہے مگر ساقی نہیں

گرچہ اے دہلی! ترے دل میں دفینے ہیں بہت
تیرے ہر گوشے میں پوشیدہ خزینے ہیں بہت
تیری مٹی میں نہاں بے تاب سینے ہیں بہت
تو وہ دریا ہے کہ گم تجھ میں سفینے ہیں بہت

آج لیکن تجھ میں اک فخر زمن خوابیدہ ہے
پیکر صدق و صفاو علم وفن خوابیدہ ہے

جس کی ساری داستاں تھی داستانِ علم و فن
جس کی موجِ نطق سے آباد تھا اپنا چمن
جس کو کہیے آبروئے شیخ و فخر برہمن
آج سوتا ہے تری مٹی میں وہ نازِ وطن

نور سے معمور اک ہیرا ترے دامن میں ہے
جس نے ظلمت کا جگر چیرا، ترے دامن میں ہے

ناز کر بخت رسا پر ،خاک دہلی! ناز کر
تیری خاک پاک میں پنہاں جو ہیں لاکھوں گہر
آج شامل ان میں ہے وہ صاحب ذوق نظر
فکر جس کی تھی تجلی بخش خورشید و قمر

کیا کہوں ،دہلی ! تجھے کیا سروری حاصل ہے آج
تیری مٹی کو فلک پر برتری حاصل ہے آج

اے غلاموں کا لہو گرمانے والے،الوداع !
آگ سی الفاظ میں برسانے والے ،الوداع!
خود تڑپ کر بزم کو تڑپانے والے،الوداع
اے جگا کر ہند کو ،سوجانے والے،الوداع

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

☆☆☆

(قومی آواز، دہلی ۳-۲۲/اگست ۲۰۰۰ء)

Maulana Abul Kalam Azad

A Versatile Genius

M. Ishaq Bhatti

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna